حیرت زار

انتخابِ کلام

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ

مُرتّبہ

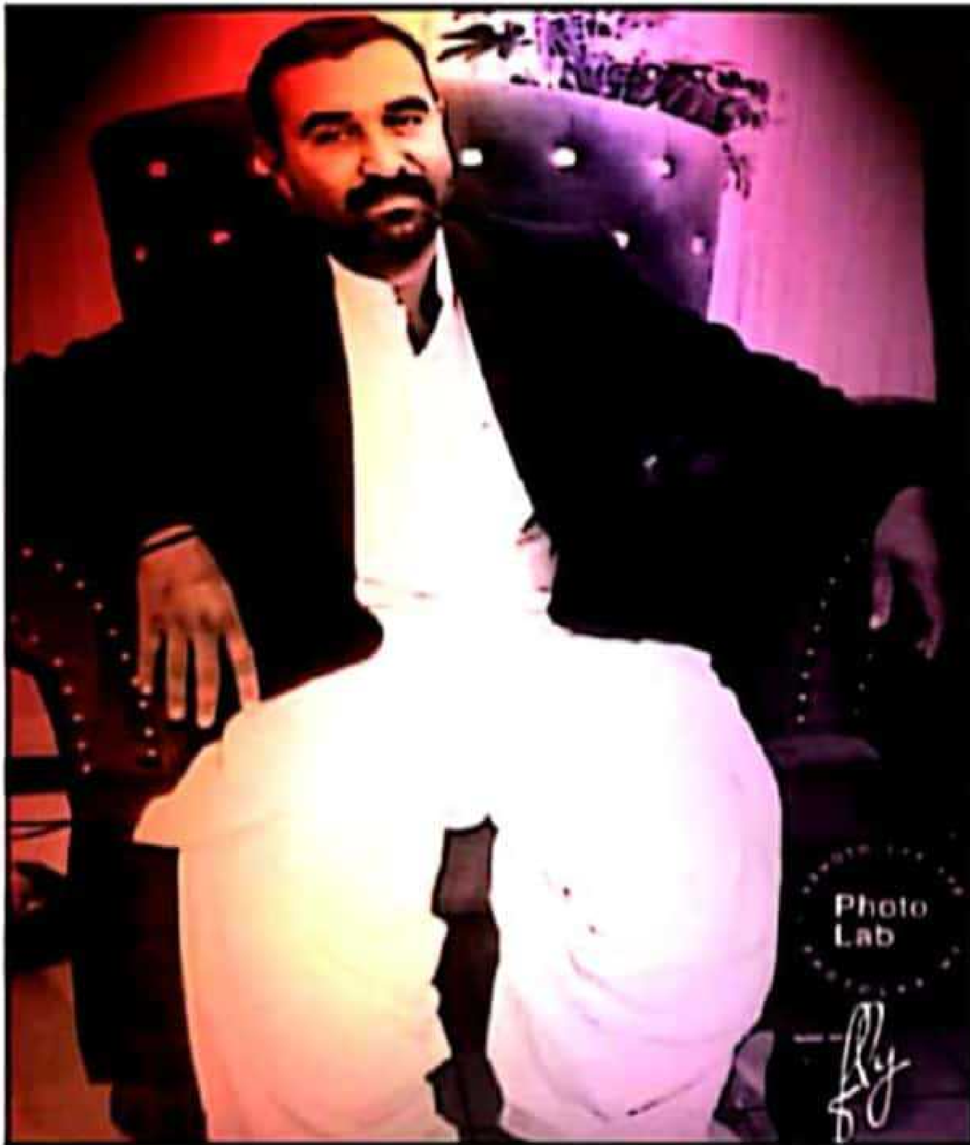
پروفیسر سیّد شاہ محمد عطاءالرحمٰن عطاؔ کاکوی

ناشر

ایوانِ اُردو پٹنہ ۴

بارِ اوّل ۱۹۵۶ء

قیمت :- ایک روپیہ بارہ آنے


Photo
Lab

مطبوعہ برقی آرٹ پریس۔ سبزی باغ۔ پٹنہ۔ ۴

فہرست

پیش لفظ

بیدلؔ آں شعلہ کز و بزم چراغاں گرم است
یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تاباں شدہ است

بیدلؔ کی شاعری کا پس منظر اس کا یہی شعر ہے - اسی آئینہ خانہ میں بیدلؔ حیرت زدہ کھڑا ہے - اس کے کلام کا مطالعہ کیجئے ، معلوم ہوتا ہے ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے ، ایک نہ ختم ہونے والی تمنّا ہے ، ایک منزل ناآشنا تجسّس ہے جو سارے کلام میں جاری وساری ہے - وہ اپنی ہستی کو ذات مطلق میں گم کرنا نہیں چاہتا - اس کا مسلک تو یہ ہے کہ " تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدنہا " اس کو آسودگی پسند نہیں - ایک اضطراب مسلسل ایک جد و جہد کا جذبہ ہے جو ہر جگہ کار فرما ہے - بہشت کی راحت جاوید اس کو کہاں پسند ؟

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید
جائیکہ بہ داغت نہ طپد دل چہ مقام است

ہنگام وصل ہیں بھی وہ زحمتِ انتظار کا شیدائی ہے ؎

محو یاریم و آرزو باقیست + وصل ما انتظار را ماند

اسکے سارے کلام میں ایک جوش و خروش ہے ایک ولولہ ہے ایک تڑپ ہے۔

؎ ہر غبارے کہ دریں عرصۂ طوفاں برخاست
ہمہ از شوخیٔ و بے باکیٔ جولاں برخاست

اس کی نگاہ مطالعہ فطرت کے لئے وا ہے ، ہر ذرہ اپنی زبان خموش سے سخن طراز ہے۔ ع

از زمیں تا بہ آسماں سخن است

اس کے سمجھنے کے لئے چشم بصیرت درکار ہے۔ ع

چشم واکردن زمیں تا آسماں فہمیدن است

بیدل کو سکون پسند نہیں ۔ کائنات کی ہر چیز متحرک ہے ۔ سفر میں ہے یہانتک کہ

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درید
نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے می خواہد

اس کا مسلک ہی یہی ہے کہ ع

عمر آسودگیٔ ما بہ سفر می گذرد

غالب نے بھی یہیں سے یہ درس لیا کہ ع

زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد

اقبال نے بھی یہیں سے یہ سبق پڑھا ع

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

عظمت انسانی اقبال کی شاعری کا محور ہے مگر اس کا سرچشمہ بیدل ہی کا کلام ہے۔ ؎

ہر ذرۂ عالم خاک شد تا بست نقش آدمی

اے بہار نیستی از قدر خود آگاہ باش

بے خودی میں بھی وہ اپنے خودی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ع

بہ دریا ہمچو گوہر خلوتے در انجمن دارم

خودداری اور شان استغنا کی مثال غالب کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ع

اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور اقبال کے یہاں ؎

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ

پہونچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

مگر بیدلؔ کس غضب کے انداز میں کہ گیا ہے ؎

در ہائے فردوس وا بود امروز
از بے دماغی گفتیم — "فردا"

مختصر یہ کہ بیدلؔ کے کلام میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اس کے دلی جذبات و مشاہدات کا پرتو ہے۔ اس کی شاعری تمام تر جذباتی ہے، محض تخیئلی نہیں اسی لئے اس میں بڑی کیفیت ہے۔ غالبؔ نے بھی اس کا رنگ اختیار کرنا چاہا مگر چونکہ وہ اس جذبہ سے محروم تھا اسی لئے بیدلؔ کے نقشِ قدم پر چلنا اس کے لئے قیامت ہوگیا۔ وہ آگ جو بیدلؔ کے دل میں لگی ہوئی تھی، وہ سوز جس سے اس کا دل و جگر برشتہ تھا وہ غالبؔ کے یہاں کہاں ؟ —

اقبالؔ پر بیدلؔ کا پرتو بڑی حد تک پڑا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ شبلیؔ کے جیسا ناقد اور فارسی کا شاعر بیدلؔ کے کلام کی عظمت سے آگاہ نہ ہوسکا۔ عام تذکرہ نویس بیدلؔ کی عظمت کے قائل تو نظر آتے ہیں مگر اس کی روحِ شاعری تک اب تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوئی ہے۔ میں نے اس انتخاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ مختصر پیمانہ پر قارئین بیدلؔ کے کلام سے آشنا ہوجائیں اور ایک اجمالی خاکہ

ان کی نگاہوں کے سامنے پیش ہو جائے۔ ورنہ بیدؔل کا کلام تو ایک بحر ناپیدا کنار ہے اس کی شناوری آسان نہیں۔ بیدؔل کے حالات اور ان کے کلام پر تنقیدی جائزہ کے لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت سلیمان ندویؒ، جناب نیاز فتحپوری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مضامین جو بیدؔل سے وابستہ تھے ان کو شامل کر کے اپنے اس مختصر مجموعہ کو وقیع اور دلچسپ بناؤں۔ اب بیدؔل ہی کے ایک شعر پر اپنا پیش لفظ ختم کر کے قارئین کو کلام بیدؔل کے مینا خانہ کی سیر کی دعوت دیتا ہوں ؎

نزاکتہا ست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

مظفرپور
یکم جنوری ۱۹۵۶ء

عطا کاکوی

بیدل کے متعلق نیاز کے تاثرات

ایک دوست نے بیدل کا تذکرہ چھیڑ دیا - نیاز صاحب بھرے بیٹھے تھے یوں اُبل پڑے :-

بیدل! ہائے بیدل!! وائے بیدل!!! آپ نے بھی کیا ذکر چھیڑ دیا- اس "کم بخت" میں فارسیت ہو یا نہ ہو، لطفِ زبان پایا جائے یا نہ پایا جائے، لیکن اس کا کیا علاج کہ تخئیل کا بادشاہ ہے، ندرت بیان کا خدا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک رندِ ژولیدہ مو ہے، جو لفظ اس کے مُنہ سے نکلتا ہے وہ دل میں تیر و سناں کی طرح پیوست ہو جاتا ہے۔

ہر کجا نکہتِ گل پیرہنِ رنگ درد
نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے می خواہد

پھول کو "پیرہن رنگ" کہنا اور نکہت کو گل کی "جامہ دری" حسن تعبیر کی وہ حد ہے جہاں نہ نظیری کی رسائی ہے نہ حافظ کی- اور "از خود سفرے می خواہد" تو وہ انداز بیان ہے جسے بہت سے ناواقف صرف مغربی لٹریچر کی خصوصیت سمجھے ہوئے ہیں- نکات اور چہار عنصر پر کیا موقوف ہے اس کا تو ایک ایک لفظ

حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔ مثنویاں دیکھئے، رقعات کا مطالعہ کیجئے، قطعات و رباعیات پر سر دُھنئے۔ لیکن زبان دکھولئے، کون سمجھتا ہے اور کسے سمجھنے کا ہوش ہے، وہ خود کہہ گیا ہے ؎

چہ رسد ز نشۂ معنوی بہ دماغ بے حس و بے خبر
زپری پیالہ اگر کشی بہ دکانِ شیشہ گراں مبر

اصغر کی صوفیانہ شاعری پر تبصرہ کرتے کرتے نیاز صاحب ایک بار پھر بیدل پر اُتر آتے ہیں اور یوں رقم طراز ہیں :۔

تصوف یا تصوف کی شاعری میں جن چیزوں کو اسرار و معارف، علم و عرفان وغیرہ بہت سے مہمل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، وہ صرف دو نظریوں میں محدود ہیں۔ ایک یہ کہ خدا ہر جگہ اور ہر چیز میں ساری وطاری ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی کہنہ حقیقت دریافت کرنے سے انسان عاجز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریے "علم قطعی" سے تو تعلق رکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ان دو نظریوں میں سے ایک میں جہل و عجز کا اعتراف ہے۔ اور دوسرا جسے نظر "ہوبیت" یا "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ایک ایسی تعبیر ہے جسے ایک خیال پرست شخص تو مان سکتا ہے لیکن علم کو درجۂ یقین تک پہونچانے والوں کے لئے

اس میں زیادہ سامان دل چسپی موجود نہیں۔ پھر جب تصوف کی بنیاد ہی ایسے مجہول نظریوں پر قائم ہے تو اس میں اسرار و غوامض یا علوم و معارف کیا ہو سکتے ہیں۔ اور پھر ایک شاعر ان کے اظہار میں وہ کون سی بات پیدا کر سکتا ہے جو جوش و ولولہ کی حامل ہو۔

اس نوع کے شاعروں میں سب سے بلند مرتبہ بیدل کا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی اسی عالم حیرت و استعجاب میں بسر کر دی جو فلسفۂ "ہوّیت" نے اس پر طاری کر دیا تھا لیکن کیا اس کی قدر غزل گوئی کے لحاظ سے کی جاتی ہے؟ کیا وہ اپنے رنگ تغزل کی وجہ سے کامیاب شاعر کہا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کی کامیابی کا راز صرف اس کا انداز بیان، تنوع تعبیرات اور علوئے تخئیل ہے، جو انسان کی قوت متخیلہ کو مسحور کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علاوہ بیدل کے اس وقت تک کوئی دوسرا شاعر اس رنگ کا پیدا ہوا ہے؟ اس نے غزل گوئی ترک کر کے جس شاعری کی بنیاد ڈالی اس کے لئے اس نے ایک زبان بھی علٰحدہ وضع کر دی۔ اور یہ خصوصیت تھی جس نے اس کو ایک مخترع اور مبدع کی حیثیت سے دنیا میں پیش کیا اور اس اختراع اور ابداع کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ دوسرا راز بیدل کی کامیابی کا یہ تھا کہ وہ فارسی

زبان میں شاعری کرتا تھا جو اُردو کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، زیادہ لطیف و شیریں اور زیادہ ایجاز کی گنجائش رکھتی ہے۔ اس لئے اردو میں اگر اس کا تتبع کیا بھی جائے تو کامیابی ممکن نہیں[1]۔ کیونکہ اول تو بلند سے بلند خیال کوئی ایسا نہیں جو بیدل کی دسترس سے باہر رہا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اُردو میں الفاظ کی کمی اور حروف و روابط کی زیادتی نے اس کو محال بنا دیا ہے

نیاز صاحب کے کوئی دوست اُردو زبان میں ندرت و شوخی کے دلدادہ تھے، انہوں نے ان سے اس کے متعلق کچھ پوچھا۔ ان کا جواب وہ ان الفاظ میں دیتے ہیں :۔

اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا۔ میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کروں گا، کیونکہ فارسی ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے عربی جاننے پر۔

---

[1] غالب کو بھی اعتراف ہے کہ ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے "عطا"

جس ندرت و شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوائے غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ فارسیت کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے ۔ نزاکتِ خیال اس میں شک نہیں بیدل کا حصہ ہے، لیکن اس میں یہ لطفِ زبان کہاں ؟

جب تک آپ جوان ہیں "خراباتِ غالب" نہ چھوڑیئے ، انحطاطِ عمر میں البتہ "مصحفِ بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں ۔

میری نہ کہئے ۔ یہاں ہر بات الٹی ہے ۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا ، اب زمانۂ انحطاط میں غالب پر سر دھنتا ہوں ۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے ، بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا ۔

ایک دوسری جگہ بیدل کے تصوف کا خاکہ وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

یقیناً میں بیدل کا شیدا ہوں اور اس لئے مجھے "بیگانۂ لذتِ تصوف" کہنا درست نہیں ، لیکن وہ چیز تصوف میں ہے کہاں جو آپ مجھ سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں وہاں تو خدا ہی اتنا ہے اور اتنا کہ ساری کائنات پر محیط ۔

تصوف کی دنیا حشر و نشر، فردوس و جہنم سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور وہاں کفر و اسلام دونوں ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ کبھی آپ نے اس کے اس شعر پر بھی غور کیا ہے ؟

درہائے فردوس وابود امروز
از بے دماغی گفتیم۔ فردا

اس سے زیادہ صریح انکار حشر و نشر یا دوسرے عالم کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یعنی جس چیز کو فردوس بتاتے ہیں اس کے دروازے تو ہم پر آج ہی اسی دنیا میں کھلے ہوئے تھے، لیکن یہ ہماری بے دماغی تھی کہ ہم نے اسے فردا پر ٹال دیا۔

رہ گیا طاعت و بندگی کا سوال۔ سو اس باب میں بیدل کا فیصلہ یہ ہے:۔

مشرب پروانہ از آتش نہ داند طور را

اصل مقصود تو محبت میں تڑپتے رہنا ہے اور محبت یہ نہیں دیکھتی کہ تڑپانے والا کون ہے ؟

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اب آپ کیا فرماتے ہیں ؟ اگر کوئی اور "صاحب دل" آپ کی نگاہ میں ہو تو اس کا پتہ بتائیے۔ شاید حشر و نشر والا خدا' اپنے بندوں کو آگ میں

جھونک کر خوش ہونے والا خدا وہیں مل جائے ۔

ایک شخص نیاز صاحب سے بیدل پر "ریسرچ" تحقیقی کام کے متعلق استفسار کرتے ہیں، بیدل کا تذکرہ آیا اور نیاز بے تاب ہو گئے ۔ یوں رقم طراز ہوتے ہیں :-

بندہ نواز ! آپ نے بیدل کا تذکرہ کرکے مجھے بے چین کر دیا ۔ جی تو میرا بھی وہی چاہتا ہے جو آپ فرماتے ہیں ، لیکن عرفی کا شعر آپ نے سنا ہو گا ؎

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

پھر سب سے بڑا سوال وقت وفرصت اور صحت وتوانائی کا ہے ۔ اگر آپ کے پاس " کایا پلٹ " کا نسخہ ہو تو بھیج دیجئے تاکہ اسے استعمال کرکے پہلے جوان ہو جاؤں پھر ملک الموت سے وعدہ لیجئے کہ وہ کسی ناگہانی حادثہ کی صورت میں بھی کم از کم پچاس سال تک میرے سامنے نہ آئیں گے ۔ سچ کہتا ہوں کہ بیدل پر ریسرچ کرنے کے لئے اتنے ہی وقت واطمینان کی ضرورت ہے ۔

آج کل کے بعض نوجوان جو فارسی میں ایم ۔ اے اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی تیاریاں کر رہے ہیں ، میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ وہ کس موضوع

پر ریسرچ کریں۔ میں نے ان میں سے ہر ایک کے سامنے بیدل کا نام لیا، لیکن ان میں سے کسی نے سانس تک نہ لی۔ وہ غریب کیا کریں خود ان کے اساتذہ میں بیدل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں[1]۔ آپ کے حلقہ میں اگر کوئی سرپھرا نوجوان ایسا نظر آئے تو اسی کو آمادہ کیجئے۔ جہاں تک مشورہ کا تعلق ہے میں ہر وقت حاضر ہوں۔

ایک دوسرے صاحب بیدل کے متعلق نیاز صاحب سے کچھ پوچھتے ہیں، وہ ان سے ذرا کھل کر بات کرتے ہیں اور اپنے تفصیلی خیالات اِن الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

صدیق محترم ! خط ملا، نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی۔ اب تو کوئی شخص بیدل کا ذکر کر دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "صدائے الست" معلوم نہیں کتنی دور سے آ رہی ہے۔ حال ہی میں ایک صاحب تشریف لائے تھے، وہ بھی ڈاکٹریٹ کے لئے بیدل کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے مدد اور مشوروں کے طالب تھے۔ وہ کہتے رہے میں سُنتا رہا اور جب آخر میں نے

---

[1] الا ماشاء اللہ۔ (اضافہ عطا)

ان سے فرمائش کی کہ بیدل کا کوئی شعر سنائیے جو آپ کو بہت پسند ہو تو معلوم ہوا کہ حضرت (حضرت) نے بیدل کا صرف نام ہی سنا ہے اور اس کا کلام دیکھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ اپنا مقالہ کب تک پیش کرنا چاہتے ہیں، فرمایا "سال آئندہ"۔ میں نے جواب میں بیدل کا یہ مصرعہ انہیں سنا دیا :—

زشبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گل را

اور خاموش ہو رہا۔

آپ سے مگر میں ایسی باتیں نہیں کرسکتا کیونکہ آپ کے مطالعہ و ذوق دونوں سے واقف ہوں۔

سب سے پہلا اور سب سے بڑا کام یہ ہے کہ بیدل کے کلام کی جستجو کی جائے۔ عرصہ ہوا نول کشور پریس نے اس کا کلیات اور مجموعۂ نثر جس میں چہار عناصر[1] اور نکات بھی شامل تھے، طبع کیا تھا[2] اور ہر چند وہ مکمل نہ تھا، لیکن اب یہ نامکمل ایڈیشن بھی نہیں ملتا۔ نول کشور سے

---

[1] مجموعہ کا نام چہار عنصر مشہور ہے۔ عطا

[2] مطبوعہ ۱۲۹۳ھ، بمبئی والے نسخہ سے نول کشور قدیم ہے۔ عطا

پہلے مطبع صفدری بمبئی نے ۱۲۹۹ھ میں ایک مجموعہ شایع کیا تھا[1] اور وہ نسبتاً زیادہ مکمل تھا مگر اب وہ بھی نایاب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کے کتب خانوں میں کہاں کہاں اس کی تصانیف کے مخطوطات مل سکتے ہیں، مگر ہوں گے ضرور۔ جس زمانے میں میرا قیام حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس تھا اس وقت ان کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ بیدل کا دیکھا تھا جس میں بہت سی چیزیں مطبوعہ نسخوں سے زیادہ تھیں۔ معلوم نہیں یہ نسخہ اب بھی موجود ہے یا نہیں۔ نثر میں اسکی تین چیزیں ہیں۔ نکات[1]، چہار عناصر[2] اور رقعات[3] لیکن ان میں ہزاروں اشعار پائے جاتے ہیں باقی اس کا تمام کلام منظوم ہے جس کے شعروں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے۔ اس کے دیوان میں بھی تیس ہزار اشعار سے کم نہیں۔ لیکن اس کی دوسری تصانیف میں بھی غزلیں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اگر ان سب کو اکٹھا کر لیا جائے تو اس کے دیوان کا حجم دوچند ہو سکتا ہے۔

میرے پاس وہی بمبئی والا نسخہ ہے۔ اس میں سب سے پہلے "مثنوی عرفاں"

---

[1] اس سے پہلے مطبع احمدی دہلی نے ۱۲۷۶ھ میں دو جلدوں میں کلیات شایع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد خدا بخش لائبریری میں اور دوسری جلد میرے پاس ہے۔ عطا

درج ہے اور پھر مثنوی "طور معرفت" اس کے بعد نکات، اشارات، رقعات، چہار عناصر، مثنوی محیط اعظم۔ غزلیات، رباعیات، مثنوی "طلسم حیرت" قصاید فیوض ہیں اور گو میں جانتا ہوں کہ یہ نسخہ ناقص ہے۔ تاہم اس میں بھی جو کچھ ہے وہ اتنا ہے کہ ایک شخص پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی اس کا مطالعہ ختم نہیں کر سکتا۔

پندرہ سال کی عمر سے اس وقت تک بیدل کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہیں اٹھا سکا۔ بیدل کا ذوق انسان میں عجیب قسم کا ذہنی استسقا پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی ہر چیز سمجھ لینے کے لئے اس کے کلام کی بیتابانہ ورق گردانی کرنے لگتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی کسی خصوصیت کو نہیں پہچان سکتے۔

میری رائے میں سب سے پہلے چہار عناصر کا مطالعہ کرنا چاہئے، کیونکہ اسی سے کچھ پتہ بیدل کی زندگی کا بھی چلتا ہے۔ نیز یہ کہ کن واقعات وحالات سے وہ کیوں کر متاثر ہوا۔ اس کے بعد نکات پڑھنا چاہئے اور اگر زندگی وفا کرے تو اس کی مثنویوں کی تلاوت کرنا چاہئے کہ بیدل کی شاعری کا کمال انہیں سے ظاہر ہوتا ہے۔

بیدل کا کلام اپنے پیام کے لحاظ سے یکسر غیر متنوع ہے اور زبان کے

لحاظ سے بھی درس و تدریس کی چیز نہیں۔ لیکن انداز بیان اور نزاکت تخیل کے لحاظ سے وہ یقیناً اس دنیا کی چیز نہیں۔ بیدل ہی دنیا کا سب سے پہلا اور آخری شاعر ہے جس کی زبان تخئیل نے پیدا کی اور تخئیل ناورائی ادراک نے۔

صنف نازک کی ایک فرد نے نیاز صاحب کو ایک خط لکھا اور بیدل سے دل چسپی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں وہ یوں لکھتے ہیں :۔

نیاز نوازی کا شکریہ — مکتوب گرامی کا جواب کافی تفصیل چاہتا ہے اور شاید حضوری بھی، سو ان میں ایک چیز مجھ سے متعلق ہے اور دوسری آپ سے۔

آپ کا بیدل سے لگاؤ بڑی مسرت آمیز حیرت کی بات ہے۔ مسرت تو اس لئے کہ آپ میری ہم مشرب نکلیں اور حیرت اس لئے کہ آج کل مردوں میں بھی کوئی شناسائے بیدل نظر نہیں آتا چہ جائیکہ نسائی طبقہ کے کسی فرد کی طرف سے اس ذوق کا اظہار۔

دل کو آئینۂ تمثال کہنا بیدل کی بڑی محبوب چیز ہے اور چونکہ آئینہ کا کوئی نقش مستقل نہیں ہوتا اس لئے وہ اسے وحشت پیوند کہتا ہے۔

شعر[۱] کا مفہوم یہ ہے کہ میرے دل میں جو نقش ابھرتا ہے وہ آخر کار وحشت انجام ہی نظر آتا ہے اس لیے حیران ہوں کہ وہ کون بے وفا ہے جس نے میرے دل کو آئینہ تمثال بنا کر اس عذاب میں مبتلا کر دیا۔ مدعا یہ ہے کہ دل میں اب سوائے جلوۂ دوست کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے اور اس کے علاوہ جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ باعثِ وحشت ثابت ہوتا ہے۔ بے وفا یہاں پیار کے لب و لہجہ میں استعمال کیا گیا ہے۔

نیاز صاحب اپنے ایک دوست کو خط میں مبالغہ اور نکتہ وری کا فرق بتاتے ہوئے بیدل سے اس کی سند پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مبالغہ میں حسن پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ غالب کے اکثر اشعار ایسے ہیں کہ اگر وزن و قافیہ علیحدہ کر کے ان کا ترنم دور کر دیا جائے تو دل و دماغ کے علاوہ سامعہ کو بھی ناگوار ہوں۔ یہ مبالغہ ہوا نکتہ وری نہ ہوئی۔

بیدل کی شاعری میں اس رنگ کے اشعار اکثر نظر آتے ہیں اور یہ

---

[۱] بیدل کا شعر یہ ہے ؎ بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد
نمی دانم کدامیں بے وفا آئینہ چید اینجا

اس کا معجزہ ہے کہ تغزل سے کسی جگہ نہیں ہٹتا۔ کہتا ہے ؎

باغے کہ بہارش ہمہ سنگ است دلِ او
دشتے کہ غبارش ہمہ آب است دلِ ما

اس سے زیادہ آرٹ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اضداد کو یکجا کر دیا جائے، لیکن بیدلؔ کا کمال ہے کہ "پتھر پانی اور خاک" سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس نے اس طرح پیش کر دیا کہ تنافر محسوس کرنے کے، بجائے آپ ایک خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں۔

ایک شعر اور سنئے :۔

کفِ خونے کہ دارم تا چکیدن خاک می گردد
چساں گیرم بہ ایں بے مائگی دامانِ قاتل را

مصرعہ اول میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ لیکن دوسرے مصرعے میں اس قدر غضب کی کشش تغزل ہے کہ ذہن کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ خون کے خاک ہو جانے پر غور کرے۔

دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

ز نیرنگِ فسوں پردازیِ الفت چہ می پرسی ؟
تو در آغوشیِ و من کشتۂ از دور دیدن ہا

یہاں بھی وہی اضداد ہے یعنی قرب وبُعد کو یکجا کر دیا ہے۔ لیکن آپ اسے مبالغہ قطعاً نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کیا ہے؟ وہی نکتہ وری۔

بیدؔل کے بعض اشعار اس معیار سے گرے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اور باوجود مبالغہ نہ ہونے کے بھی ان میں نکتہ وری نہیں پائی جاتی یعنی ادعائے شاعرانہ تو ہے لیکن ثبوت اچھا بہم نہیں پہونچ سکا۔ مثلاً

دلِ گم گشتہ سراغ ست زکیفیت شوق
نشہ بالد اگر از دست رود شیشۂ ما

ایک شعر ایسا ہی اور سنئے :-

عیش داند دلِ سرگشتہ پریشانی را
ناخدا باد بود کشتیٔ طوفانی را

اس میں بھی کوئی بات نہیں۔ الغرض مبالغہ اور نکتہ وری میں فرق کرنا ضروری ہے۔

بیدؔل کے حالات کے متعلق نیازؔ صاحب رقم طراز ہیں :-

بیدؔل کے حالات موجودہ تذکروں میں بہت ناکافی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کاوش کرے تو خود انہیں کے کلیات خصوصاً چہار عناصر سے بہت

کچھ حالات فراہم ہو سکتے ہیں۔ تذکروں میں صرف حسین قلی خاں عظیم آبادی کا تذکرہ نشترِ عشق (جس کا ایک قلمی نسخہ یہاں موجود ہے) ایسا ہے جس میں نسبتاً زیادہ حالات نظر آتے ہیں اور جو غالباً کلیات ہی سے جمع کیے گئے ہیں۔

اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدلؔ کی ولادت بہ مقام عظیم آباد[1] (پٹنہ) ۱۰۵۴ھ میں ہوئی جس کا مادۂ تاریخ لفظ "انتخاب" سے نکلتا ہے۔ ترکوں میں ایک قبیلہ یا جماعت برلاس[2] کے نام سے مشہور ہے، ان کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ باپ کا نام مرزا عبدالخالق تھا۔ مرزا عبدالقادر بہت کم سن تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا، لیکن اسقدر کم سن نہ تھے کہ اس حادثہ کا اثر قبول نہ کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کے غم میں کچھ اشعار بھی لکھے تھے اور انہیں میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ؎

خورشید خرامید و فروغے بہ نظر ماند
دریا بہ کنارِ دگر افتاد و گہر ماند

ہم یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یہ شعر ان کی کم سنی کا ہے۔ البتہ یہ ممکن

---

[1] ان کے عظیم آبادی ہونے کے متعلق علّامہ سلیمان ندوی کا مضمون اسی کتاب میں دیکھئے۔ "ع"

[2] یا ارلاس ؟ "ع"

ہے کہ جب سن شعور کو پہونچ کر انہوں نے اپنے مختلف جذبات کو منظوم کیا تو اس سلسلہ میں اس حادثہ کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا۔

جب پانچ سال کی عمر میں یہ کلام اللہ ختم کر چکے تو عربی کی تعلیم شروع ہوئی، جیسا کہ اب سے پہلے تمام مسلمان گھرانوں میں رواج تھا۔ جب دس سال کی عمر میں کافیہ ختم کر کے شرح ملّا کا درس شروع ہوا تو ایک دن ان کے چچا مرزا قلندر، جو ان کے سرپرست تھے اس مدرسہ میں پہونچے جہاں ان کی تعلیم ہوتی تھی۔ اتفاق سے اس وقت دو طالب علموں میں کسی مسئلہ علمی پر گفتگو شروع ہو گئی۔ مرزا قلندر نے دیکھا کہ جو طالب العلم شکست کھا رہا ہے وہ منفعل ہوتا جاتا ہے اور غالب طالب علم میں کبر و نخوت کا انداز پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر انہوں نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ چلو اٹھو۔ اس تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں جس کا نتیجہ صرف انفعال ہے یا نخوت۔ چنانچہ یہ اپنے چچا کے ساتھ اُٹھ کر چلے آئے اور زیادہ وقت فقرا کی صحبت میں بسر کرنے لگے۔

میرزا ابتدائے عمر سے بے انتہا ذہین، موزوں طبع اور حسن پرست تھے۔ مدرسہ میں ان کے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا تھا جس سے یہ بہت مالوف تھے۔ یہ ہمیشہ اپنے مُنہ میں لونگ رکھتا تھا جس سے گفتگو کے وقت خوشبو پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ مرزا نے یہ رباعی اسی الفت کی یاد میں تحریر

کی ہے :-

بار م ہرگاہ در سخن می آید   بوئے عجبے کہ از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل ست یا نکہت گل   یا رائحہ مشک از ختن می آید

فن شعر میں انہوں نے مولنا کمال نامی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور رمزی تخلص تجویز کیا۔ ایک دن گلستاں کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ یہ مصرعہ نظر آیا " بے دل از بے نشاں چہ گوید باز" اور اسی وقت سے اپنا تخلص بدل کر بیدل کر دیا۔

اول اول سرکار شاہ شجاع (شاہ جہاں کا بیٹا اور بنگال کا حاکم) سے تعلق پیدا ہوا اور جب سن تمیز کو پہونچے تو شاہزادہ محمد اعظم شاہ کے دربار میں پانصدی منصب پر ممتاز ہو گئے۔ کسی نے شاہزادہ محمد اعظم سے کہا کہ میرزا عبدالقادر فن شعر کا بڑا ماہر ہے اور نہایت نادر مضامین نظم کرتا ہے۔ محمد اعظم شاہ نے لوگوں سے کہا کہ میرزا سے کہو میری تعریف میں قصیدہ لکھے۔ میں اسکو بہت بلند مرتبہ پر پہونچا دونگا۔ میرزا کو معلوم ہوا تو انہوں نے انکار کر دیا اور جب زیادہ اصرار کیا تو ترک تعلق کرکے دوآبہ کی طرف چلے آئے اور اکبر آباد۔ متھرا وغیرہ کی سیاحت کرکے شاہجہاں آباد آ گئے۔ یہاں پہونچ کر انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور حد درجہ استغنا ان کی

طبیعت میں پیدا ہوگیا۔

رفتہ رفتہ اکثر امرار دربار ان کے عقیدت مند ہوگئے۔ چنانچہ نواب شکر اللہ خاں، شاکر خاں وغیرہ کے نام جو رقعات ان کے کلیات میں نظر آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کے تعلقات ان لوگوں سے کیسے تھے۔

نواب آصف جاہ والی دکن جو آصف تخلص کرتے تھے اپنا کلام مشورہ کے لئے میرزا کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ ایک بار انہیں دکن بھی طلب کیا لیکن انہوں نے جواب میں صرف یہ لکھ کر بھیجا کہ ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش

من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

میرزا کو فارسی زبان اور اس کے مصطلحات پر بڑا عبور حاصل تھا۔ اور دقت پسندی، بلند پروازی ان کی خصوصیت تھی۔ انہوں نے نظم ونثر کا انداز ہی بالکل بدل دیا اور وہ جدید اسلوب اختیار کیا جو اس سے قبل فارسی میں رائج نہ تھا۔

میر غلام علی آزاد نے اپنے تذکرہ میں ان کے تصانیف کی فہرست حسب ذیل ظاہر کی ہے :-

(۱) کلیات نظم و نثر جس میں ایک لاکھ سے زیادہ ابیات تھے۔

(۲) نسخۂ عرفاں۔ چار ہزار بیت کا

(۳) طور معرفت۔ تین ہزار بیت کا

(۴) ساقی نامہ۔ دو ہزار بیت کا

(۵) تنبیہ المہوسین۔ ایک ہزار بیت کا

(۶) ترجیع بند۔ فخر الدین عراقی کے جواب میں۔ سات ہزار بیت۔

(۷) صنائع و بدائع۔ سات ہزار بیت۔

(۸) چہار عناصر۔ اٹھارہ ہزار بیت [۱]

صاحب تذکرہ سرخوش لکھتا ہے کہ میں نے ان کے کلیات کو وزن کیا تھا۔ پندرہ سیر نکلا تھا۔

انہوں نے ۷۹ سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۱۳۰ھ میں صفر کی چوتھی تاریخ کو پنجشنبہ کے دن تپ محرقہ میں انتقال کیا۔ جس مکان میں رہتے تھے وہیں دفن کئے گئے۔ ماثر الکرام میں تاریخ وفات ۳ صفر سنہ ۱۱۳۳ھ لکھی ہے۔ [۲]

۱؎ یہ نثر کی کتاب ہے جس میں چار عنصر ہیں۔ درمیان تحریر اشعار نظم ہوتے چلے گئے ہیں۔

۲؎ یہی تاریخ صحیح ہے۔ "ع"

خوشگو نے ان کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ لکھا تھا:-

افسوس کہ بیدل از جہاں روئے نہفت و اں جوہر پاک در تہِ خاک بخفت
خوشگو چوز عقل کرد تاریخ سوال "از عالم رفت میرزا بیدل" گفت

۱۱۳۳ھ

میر غلام علی آزاد نے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس کا مصرعہ تاریخ بھی "میرزا بیدل از عالم رفت" ہے۔

میرزا نہایت قوی الاعضا اور زبردست قد و قامت کے انسان تھے۔ جوانی میں سات سیر اور ضعیفی میں ڈھائی سیر غذا کر لینا معمولی بات تھی۔ ان کی آہنی جریب کا وزن ۳۶ سیر (شاہجہانی) تھا۔ باوجود زہد و اتقا کے ریش و بروت کو صاف رکھتے تھے۔ خزانۂ عامرہ میں ان کی وفات کے بعد کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ میر عبدالولی عزلت سورتی ایک مرتبہ عرس کے دن ان کے مزار پر گئے تو دیکھا شاہجہاں آباد کے تمام شعرا کا ہجوم ہے اور وہیں مرزا کا کلیات رکھا ہوا ہے، انہوں نے اس نیت سے کہ دیکھیں میرزا کو میرے آنے کی خبر ہوئی یا نہیں۔ کلیات کو کھولا تو صفحہ کا پہلا شعر یہ تھا ؎

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط اس میں شک نہیں کہ میرزا بیدلؔ اپنے عہد کے نہ صرف بے مثل شاعر تھے بلکہ صاحب باطن بھی اسی درجہ کے تھے جسکا ثبوت میر عبدالولی کے اس واقعہ سے زیادہ ان کے کلام سے مل سکتا ہے۔

مرزا رحیم بیگ صاحب حصار کے رہنے والے جناب نیازؔ سے بیدلؔ کی شاعری کے متعلق ان کی رائے پوچھتے ہیں اور بیدلؔ کے چند اشعار کی وضاحت چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں جناب نیازؔ فرماتے ہیں :۔

بیدلؔ کے متعلق ملک میں دو مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے یہاں زبان کا کوئی لطف نہیں ہے۔ خیالات میں ضرورت سے زیادہ تصنع اور آورد ہے اور تخئیل کی بلندی غیر مناسب حد تک بڑھ کر معما ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بیدلؔ کی شاعری زبان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف تخئیل کی شاعری ہے اور چونکہ وہ بہت بلند ہے، اس لئے ترکیب الفاظ اور اسلوب بیان میں پیچیدگی کا پایا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ مضامین کی رفعت مستلزم ہے الفاظ و ترکیب کی ندرت کو۔ اور چونکہ ابداع و اختراع کو ہر معمولی دماغ پسند نہیں کرتا اور نہ کچھ سمجھ سکتا ہے اسی لئے اکثر لوگوں نے اس کے کلام کو مہمل کہہ دیا۔ میرا میلانِ طبع بھی یہی ہے

کہ میں اس دوسری رائے کو پسند کروں ۔ بات یہ ہے کہ بیدل نے اپنی
تمام تصنیفات میں خواہ وہ نظم کی ہوں یا نثر کی، صرف ایک فلسفہ پیش
کیا ہے اور وہ یہ کہ ذات باری کی کنہہ تک پہونچنا امر محال ہے اور
انسان اس باب میں بالکل عاجز ہے ۔ اس سلسلہ میں اس نے وحدت الوجود
کو بھی اکثر جگہ بیان کیا ہے اور صرف اسی ایک خیال کے ماتحت اس نے اپنے
ایسے بلند مضامین اور اس درجہ نازک و پاکیزہ جذبات سے کام لیا ہے کہ
ان تک ہر ذہن کی رسائی ممکن نہیں ہے ۔ یقیناً زبان کا لطف بیدل کے
کلام میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اسکی شاعری کسی معمولی عاشق کی
غزل سرائی نہیں ہے جس میں پیش پا افتادہ جذبات ہجر و وصال کا اظہار
ہو، بلکہ وہ بیان ہے ان کیفیات کا جن کا تعلق اس مادی دنیا سے بالکل
نہیں ہے اور اس کی شاعری ایک آواز ہے جو صرف اعماق روح سے پیدا
ہوتی ہے اور جن کے قبول کرنے کے لئے وسیع ترین الفاظ کا ملبوس بھی
تنگ نظر آتا ہے ۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب خیالات بلند، مضامین ارفع، جذبات
نازک، کیفیات غیر معمولی اور واردات قلب نادر ہونگے تو ان کے بیان
کرنے کے لئے عام الفاظ اور معمولی ترکیبیں کبھی کارآمد ثابت نہ ہونگی اور

لا محالہ ان کے لئے جدید اسلوب بیان، کچھ نئے الفاظ اختراع کرنے پڑینگے اور اسی حقیقت کا اظہار ہے یہ کہنا کہ

"کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے"

لیکن عام طور پر نہ دماغ ہی ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور نہ ان کی قدامت پرستی ہی اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ ہر نئی بات کو بغیر "اسناد" کے قبول کر لیں، اس لئے بیدل کے کلام کو مہمل کہنے والے زیادہ نظر آتے ہیں۔ اسی کشمکش میں غریب اقبال مبتلا ہے۔ جب تک اُردو میں اس نے اظہار خیال کیا دہلی، لکھنؤ کی لسانیات بلائے جاں بنی رہی اور اب جب کہ فارسی ملبوس اختیار کیا تو زباں داں حضرات اس میں جھول بتلاتے ہیں۔ حال آنکہ جو کچھ وہ کہتا ہے نہ اس سے قبل لکھنؤ کا روزمرہ اسے پیش کر سکا اور نہ ایرانی زبان دانی میں اس کی کوئی مثال نظر آتی ہے۔ لیکن جو نگاہیں صرف سطح تک پہونچ کر رہ جاتی ہیں، یا جن کے نزدیک صرف ظاہری آب و رنگ ہی اصل چیز ہے وہ بطونِ حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں اور اس لئے "قابل عفو"۔

ادبیات کا مسلمہ اصول ہے کہ خیال کی نوعیت کے ساتھ طرز ادا کا بدل جانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اہل نہیں ہے تو اسکو صحیح معنی

میں ادیب نہیں کہہ سکتے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن اسی لئے پسند نہیں کیا جاتا کہ انہوں نے اسکو توبتہ النصوح بنانے کی کوشش کی اور شبلی کوئی فسانہ نہ لکھ سکے کیونکہ مراۃ العروس کی زبان پر ان کو قدرت حاصل نہ تھی۔

جس طرح مذہب وسیاست دو علٰحدہ چیزیں ہیں، جس طرح تاریخ وفسانہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح ان کے لئے طرز ادا بھی علٰحدہ د ہونا چاہئے ورنہ اگر اصل چیز صرف زبان دانی ہو تو باقر علی داستان گو سے زیادہ سیرۃ نبوی لکھنے کا اہل اور انسائکلوپیڈیا لکھنے کا مستحق لکھنؤ کے قمر جاہ سے زیادہ اور کون ہوسکتا ہے۔

رنگ بیدؔل کو جو لوگ ناپسند کرتے ہیں وہ وہی حضرات ہیں جو اس اصول سے ناواقف ہیں، اور ہر خیال کو ایک ہی ملبوس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ پس یہ یقیناً تنقید کی بے اعتدالی، قیام معیار کی نامناسب اور ذہن کی نارسائی ہے جس کو کوئی ذی فہم دماغ جو ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دیکھنے کا عادی ہے ہفوات سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتا۔

بیدؔل جس آسانی کے ساتھ اپنے مدعائے دشوار کو بیان کر جاتا ہے اس کا حال اسوقت معلوم ہوتا ہے جب کوئی دوسرا اسکی تتبع کی کوشش کرے۔ غالبؔ سے زیادہ سخن گو، سخن سنج کون ہوسکتا تھا لیکن طرز بیدؔل

میں ریختہ لکھنا اس کو قیامت ہو گیا۔ چونکہ غالب کی فارسیت بہت بڑھی ہوئی تھی اس لئے اس میں اکثر جگہ بیدل ہی کے چراغ سے کسب ضیا کیا گیا اور بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

بیدل کا کلام اپنے معنی کے لحاظ سے جس بلند مرتبہ کا ہے اسی طرح لفظی خصوصیات کے اعتبار سے ایک خاص چیز ہے۔ ایک معمولی مضمون کو بھی وہ اپنے الفاظ و ندرت ترکیب سے آسمان پر پہونچا دیتا ہے۔ مثلاً قناعت کے پامال مضمون کو لیجئے کہ ہر شخص نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن بیدل محض انداز بیان سے اس میں ندرت پیدا کر دیتا ہے کہ مضمون کی فرسودگی کی طرف خیال ہی منتقل نہیں ہوتا۔ جب فرمانروائے حیدرآباد کی طرف سے نامۂ طلب پہونچا تو بیدل نے اپنی قناعت کا اظہار کر کے وہاں جانے سے ان الفاظ میں انکار کیا :-

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش

من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

پہلے مصرعہ کا مضمون نہایت معمولی تھا لیکن دوسرے مصرعہ سے جو اسکی توجیہ کی گئی تو شعر عام سطح سے نہایت بلند ہو گیا۔

دوسری چیز جو بیدل کے لئے مخصوص ہے وہ اسکے کلام کا توازن ہے۔

آپ مشکل سے کوئی ایسا شعر پائینگے جس میں عدم توازن کا نقص پایا جائے۔
توازن سے میری مراد یہ ہے کہ الفاظ کا اس قدر حسن کے ساتھ استعمال کیا جائے
کہ سارا شعر موتی کی لڑی معلوم ہو اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہ ہو جو ماقبل
اور مابعد کے لحاظ سے نامناسب سمجھا جائے۔

تیسری خصوصیت بیدؔل کی یہ ہے کہ وہ دفتر کا دفتر چند الفاظ میں
بیان کر دیتا ہے اور ہر چند بسا اوقات شعر کا تنگ میدان اس کو مجبور
کر دیتا ہے کہ بہت سی درمیانی کڑیوں کو ترک کر دے لیکن وہ بہ حیثیت مجموعی
اپنے وسیع خیال کو ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے کہ ذہن سامع از خود تمام متروک
کڑیوں کو مربوط کر کے مدعا تک پہونچ جاتا ہے اور پھر اس کی لذت میں غرق
ہو جاتا ہے۔

"ذات باری کے مظاہرہ کا تنوع اور باوجود خفا کے اس کا ذرہ
ذرہ سے ظہور" یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو قریب قریب تمام صوفی شعرا نے
بیان کیا ہے لیکن بیدؔل کی قدرت شاعرانہ ملاحظہ ہو، لکھتا ہے :-

تجدید نازِ آشفتۂ رنگ لباس آرائیت
بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب افگندنت

وہ یوں بھی کہہ سکتا تھا کہ تیری لباس آرائی کے انداز کا وہ عالم ہے کہ ہر وقت

اس سے نیا ناز پیدا ہوتا رہتا ہے اور تیری نقاب افگنی کی ادا کا وہ رنگ ہے کہ اس سے زیادہ بے پردگی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس نے پہلے مصرعہ میں لفظ "آشفتہ" اور دوسرے میں "دیوانہ" کہکر شعر کو اس حد تک پہونچا دیا کہ اس سے زیادہ ترقی ناممکن تھی۔ تجدید ناز کے متعلق یوں کہنا کہ وہ رنگ لباس آرائی کی فریفتہ ہے اور بے پردگی کو طرح نقاب افگنی کا دیوانہ کہنا، مضمون کو جسقدر بلند کر دیتا ہے، ارباب ذوق سے مخفی نہیں۔

اسی زمین میں اسی مفہوم کو دوسرے شعر سے یوں ظاہر کرتا ہے :۔

ہر بجا بر دل جو شیدہ خود را بہ خود پوشیدہ
در نور شمعت مضمحل فانوسی پیراہنت

شمع کے فانوس کا مضمحل ہو کر شمع کے چھپانے میں کامیاب نہ ہونا ایسی زیادہ بلند بات نہ تھی لیکن "خود را بہ خود پوشیدہ" کہکر یہ ثابت کرنا کہ وہ فانوس بھی تیری ہی ذات ہے۔ اور ذات بھی وہ جس کا حال یہ ہے کہ "ہر بجا بروں جوشیدہ است" ذہن کو خیال کی اس سرحد تک پہونچا دیتا ہے کہ اس کے آگے پرواز محال معلوم ہوتی ہے۔ اس غزل کا ایک اور شعر ہے :۔

در لولا بہار لم یزل جوشیدہ از باغ ازل
نہ آسماں گل در بغل یک برگ سبز گلشنت

معترض سے کہئے کہ "نہ آسماں گل" کی ترکیب کو یہاں سے علحدہ کر کے کوئی دوسرا لفظ یا فقرہ استعمال کرے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لفظ جو شیدہ کے ثبوت کو تکمیل تک پہونچانے والا ہو۔ کیا اس میں کامیابی ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔

بیدل کی قدرت شعر گوئی کا ثبوت مشکل زمینوں میں زیادہ ملتا ہے بعض بعض ایسے پیچیدہ ردیف و قافیہ کی غزلیں ہیں کہ ان میں کسی معمولی شعر کا نکلنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن بیدل وہاں بھی اسی طرح خلاق معانی نظر آتا ہے اور اس کی چیدہ ترکیبوں کا وہی عالم ہے۔ ایسے ہی ایک مشکل زمین کا مطلع ہے :-

تمام شوق تیم لیک غافل کہ دل براہِ کہ می خرامد ؟
جگر بداغِ کہ می نشیند نفس بآہِ کہ می خرامد ؟

فلسفہ وہی ہے اور خیال وہی کہ کنہ حقیقت باری کا علم حاصل نہیں ہو سکتا لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو اور اس کے ساتھ زمین کی دشواری پر نگاہ کر کے ردیف و قافیہ کا صرف دیکھئے کہ کتنا مربوط و دلنشیں ہے۔

اپنے آپ کو پرتوِ نورِ ربانی کا ایک مظہر قرار دے کر دوسرا شعر لکھتا ہے :-

اگر نہ رنگ از گل تو دارد بہار موہوم ہستی ما
زپردہ چاک ایں کتانہا فروغِ ماہِ کہ می خرامد ؟

مقطع دیکھئے ، اسی کو سحرِ حلال ، شاعرانہ اعجاز اور الہامات ربانی کہتے ہیں :-

گر ز چشمش غلط نگاہے رسد بہ فریادِ حالِ بیدل

وگرنہ آں برقِ بے نیازی پئے گیاہ کہ می خرامد ؟

یعنی اس مشتِ خاک سے زیادہ خوش قسمت کون ہو سکتا ہے جسکو وہ برقِ بے نیازی اپنا نشیمن بنانا پسند کرے۔

بیدل سمجھتا ہے کہ کب اس برق کی بے نیازیاں متوجہ ہو سکتی ہیں اور اس لئے ایک عالمِ یاس میں کہتا ہے کہ اگر کوئی صورت اسکے حصول کی ہے تو صرف یہ کہ شاید کوئی نگاہِ غلط انداز میسر آجائے۔

اس شعر میں ایک ایک لفظ کو دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوہری نے نہایت احتیاط سے نگینے جڑ دئے ہیں۔ اور اگر ایک لفظ بھی علحدہ کرکے دوسرا لفظ رکھ دیا گیا تو وہ رنگ جاتا رہے جو بہ حیثیت مجموعی ان تمام نگینوں کی آب و تاب سے پیدا ہو رہا ہے۔

کہاں تک عرض کروں۔ بیدل کا تو سارا کلام ، نظم ہو یا نثر اس لحاظ سے منتخب ہے اور ساری عمر صرف کرنے کے بعد بھی ایک شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کی لذتوں سے سیر ہو چکا ہے۔ شاید چہار عناصر کی ابتدا میں بہ سلسلہ حمد وہ اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی حقیقت تک کون پہونچ سکتا ہے اور

ہمارا یا کسی اور کا اس کے بابت کچھ لکھنا یا اسکی حمد میں کسی خیال کا اظہار کرنا کیا وقعت رکھتا ہے۔ اس خیال کو لکھتے لکھتے وہ ایک جوش میں آ کر کہتا ہے کہ:۔
"غبارے سطر آشفتگی بہ ہوا نگاشت، پندا شت مصنف کتاب آسا لم پرکا ہے بیاد فطرت بر باد گذاشت، دانست منشی طومار کہکشاں نم" یہ عالم اسکی نثر نگاری کا ہے۔ الغرض بیدل میرے نزدیک ایک ایسا شاعر تھا جس کی مخالفت ملک میں ہونی ضروری تھی ورنہ آج اس کے کمال کی کوئی یقینی دلیل پیش نہ کر سکتے"۔

معاف کیجئے حکایت لذیذ تھی اس لئے درازی کی حد تک پہونچ گئی۔

اب آپ کے مرسلہ اشعار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں :۔

(۱) بہ نمود ہستی بے اثر چہ نقاب فسق کنم از حیا
تو نگر بہ من نظرے بکنی کہ دمے عرق کنم از حیا

مطلب یہ ہے کہ میں اپنی بے اثر، ناکارہ اور فانی ہستی کو ظاہر کرنے کے لئے کیا نقاب اٹھاؤں کہ مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یعنی میں کیا ہوں جو پردہ اٹھنے کے بعد کوئی مجھے دیکھے گا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی صورت مجھے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی ہو سکتی ہے تو صرف اس طرح کہ تو یک نگاہ مجھ پر ڈالے اور میں ایک لمحہ کے لئے عرق انفعال بن کر نظر آؤں

مقصود یہ کہ یوں تو میں کچھ بھی نہیں ہوں لیکن اگر کوئی نگاہ ڈالے تو شاید تھوڑی دیر کے لئے ندامت کا پسینہ بن کر ظاہر ہو سکوں۔

(۲) اگرم دہد خطِ امتحاں ہوسِ کتاب نُہ آسماں

مژہ بر ہم آرم از ین و آں ہمہ یک ورق کنم از حیا

اس شعر میں بیدل نے دیگر مخلوقات عالم کے مقابلہ میں انسانی شرف کو نہایت خوب صورتی سے ظاہر کیا ہے اور کہتا ہے کہ اگر کتاب نُہ آسماں جرأت کر کے مجھکو امتحان کی اجازت دے دے تو میں بغیر کسی پس و پیش کے سب کو ایک ورق حیا بنا کر رکھ دوں۔ یعنی میرے وسعت خیال اور رفعتِ فطرت کو دیکھ کر وہ شرما جائے۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی کوئی وسعت انسانی قوت مطالعہ کی وسعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(۳) نیست خراباتِ جنوں عرصہ جولانِ فسوں

لغزشِ مستانہ خوش ست آبلہ پیمانہ بر آ

اس شعر میں بہ ظاہر اشکال "آبلہ پیمانہ برآ" کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس کو یوں پڑھا جائے "آبلہ پیما، نہ برآ" تو اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ اس میں "نہ برآ" فعل نہی ہے اور آبلہ پیما کی ترکیب ویسی ہی ہے جیسے بادیہ پیما، باد پیما وغیرہ۔ اس لئے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ خرابات جنوں

ہیں اگر آنا ہے تو لغزش مستانہ کے ساتھ آؤ، اسطرح نہ آؤ کہ معلوم ہو آبلہ پیمائی ہو رہی ہے۔ یعنی پھونک پھونک کر قدم نہ رکھو۔ آنا ہے تو بے دھڑک آؤ اور مستانہ وار آؤ۔

(۴) کفِ پائے حجلہ نشینِ ما بہ خیال کرد کمینِ ما
پئے آرزوئے جبینِ ما بہ چراغ رنگ حنا طلب

یہ شعر نازک ضرور ہے، لیکن بلند نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو ایک معشوق حجلہ نشیں کے کفِ پا کی یاد نے ہمارے خیال پر غلبہ پا لیا ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں ہماری آرزوئے جبیں اگر معلوم کرنا چاہتے ہو تو اسے چراغ رنگ حنا کی مدد سے تلاش کرو۔ چراغ رنگ حنا صرف کفِ پا کی رعایت سے کہا گیا۔ مدعا صرف اتنا ہے کہ اس وقت ہماری جبیں سائی کا مقصود اگر کوئی ہے تو صرف پائے حنائی کا خیال۔

(۵) چو حباب غیر لباس تو چہ توقع و چہ ہراس تو
نہ تو مانی و نہ قیاس تو چہ کشند جامہ ز پیکرت

مدعا یہ ہے کہ اے انسان تو جو اپنی زندگی کو امید و بیم میں بسر کر رہا ہے یہ سب فضول ہے کیونکہ خوف امید جو کچھ ہے اس کا تعلق حباب کی طرح صرف ظاہری ملبوس سے ہے، پھر جس طرح حباب کا ملبوس اتر جانے کے بعد

کچھ نہیں رہتا اسی طرح تیرا تعلق جب جسم سے نہ رہے گا جو اس کا ملبوس ہے تو نہ تو رہے گا اور نہ تیرے قیاسات و اوہام۔

(۶) ز بلند و پست بساط رنگ اثرے نہ زد بدر آگہی
کہ چہ بافت سبزہ کلاہ سرو و چہ دوخت خندہ قبائے گل

بساط رنگ کے بلند و پست مناظر سے اثر پذیر ہونے کے بعد اتنا علم بھی حاصل نہ ہو سکا کہ سبزہ کلاہِ سرو بنانے سے اور خندۂ قبائے گل پہننے سے عاری ہے۔ ظاہر ہے کہ سبزہ جو بہت پست ہے ترقی کرکے کلاہِ سرو نہیں بن سکتا۔ اور نہ خندۂ گل، گل کی چاک قبا کو سی سکتا ہے لیکن بساطِ رنگ کی کارگاہ اسقدر بیکار چیز ہے کہ وہاں رہ کر ہمیں اتنا بھی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۷) بہ خیالِ غنچہ نشستہ ام، بہ خیالِ آئینہ بستہ ام
ز دلِ شکستہ کجا روم چو بہارم آبلہ پائے گل

یعنی میں ایک غنچہ کے خیال میں بیٹھا ہوں اور ایک آئینہ کے خیال سے وابستہ ہوں۔ اور وہ غنچہ یا آئینہ میرا دل شکستہ ہے، پھر اب میں اس کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں کیونکہ میری حالت تو ایسی ہے جیسے بہار کہ جس طرح پھول اس کے پاؤں کا آبلہ ہے اسی طرح یہ میرا دل میرے پاؤں کا چھالا بنا ہوا ہے۔ نہ پھول بہار سے جدا ہو سکتا ہے نہ میرا دلِ شکستہ مجھ سے۔

(۸) تو بدست گاہ چہ آبرو زطرب و فا کنی آرزو
کہ نہ ساخت کاسۂ رنگ و بو بہ مزاج خندہ گدائے گل

تو کس اقتدار پر یہ آرزو کرتا ہے کہ مسرت وطرب تیرے ساتھ وفا کرے۔
گدائے گل یہ تو چاہتا ہے کہ خندہ حاصل کرے لیکن اپنے کاسۂ رنگ و بو
کو اس قابل نہیں بناتا۔ مدعا یہ ہے کہ ہم خود اس کے اہل نہیں ہیں کہ
موردِ لطف وکرم ہوں، شکایت کس کی ؟

(۹) بہ کجاست آنقدرم بقا کہ تاملے کندم وفا
عرقِ خجالتِ فرصتم نم انفعالِ زمانیم

مجھ میں اس قدر بقا کہاں ہے کہ کوئی غور و تامل کر سکوں، میری ہستی
تو گویا شرمندگیٔ فرصت کا پسینہ اور انفعالِ زمانہ کا نم ہے، یعنی میرا وجود
تو ایسا ہے کہ اگر لفظ فرصت اس کے آگے استعمال کیا جائے تو وہ شرم سے
عرق عرق ہو جائے۔

(۱۰) بہ فسردگم ہمہ تن الم بہ تردد آبلہ در قدم
چو غبار داغ نشستنم، چو سرشک ننگ روانیم

فسردگی کے لحاظ سے یکسر درد و الم ہوں اور چلنے میں بالکل آبلہ پا۔
اس لئے کیا میرا بیٹھنا اور کیا میرا چلنا کہ اگر بیٹھوں بھی تو غبار کی طرح، جو حقیقتاً

بیٹھنے کے لئے عار ہے اور چلوں بھی تو آنسو کی طرح، جو فی الحقیقت ننگ روانی ہے۔ اپنے آپ کو آبلہ در قدم کہہ کے سرشک سے تشبیہہ دینا نہایت خوب ہے۔

جناب محمد عبداللہ خان صاحب کراچی سے جناب نیاز کو خط لکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ "تکلیف تو ہوگی لیکن براہ کرم بیدل کے ان چار اشعار کا مطلب واضح طور پر بیان فرما دیجئے۔ چونکہ آپ نے اکثر و بیشتر بیدل کا ذکر کیا ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔

اس کا جواب حضرت نیاز اس طرح دیتے ہیں :۔

میں بیدل کا شمار ان شعرا میں کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان کے کلام کا مفہوم سمجھنے سے عاری ہو تو اسے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ شعر کا لطف صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بغیر وساطت توضیح و تفسیر کے وجدانی طور پر ذہن نشیں ہو جائے۔ پھر چونکہ ہر شخص کا ذوق ایک مخصوص دائرہ کے اندر کام کرتا ہے اس لئے جب اس دائرے سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے تو اس کا ذہن مشوش ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے

سمجھانے سے مفہوم سمجھ میں آ بھی گیا تو وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو از خود سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

بیدل کو شاعر کہا جائے یا نہ کہا جائے مجھے تو اس میں بھی تامل ہے۔ کیونکہ اس کی تخئیل اس درجہ نازک ہے کہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بھی بعض اوقات اس کی نزاکت تک نہیں پہونچ سکتے۔

بیدل ایک مجذوب ہے۔ شاعر نہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔ بلکہ ایک رند ژولیدہ مو' ایک سر بصحرا زدہ مجنوں کی حیثیت سے اس کی آواز کو سُننا چاہیئے۔

جو اشعار آپ نے لکھے ہیں میں اپنی فہم و فراست کے مطابق ان کا مفہوم تو بیان کئے دیتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ وہ لطف جو بغیر تفصیل و تشریح کے حاصل ہونا چاہیئے وہ آپ کو حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں صرف مفہوم ظاہر کروں گا تعبیرات شاعرانہ کو آپ اس کے مطابق کر لیجئے گا۔

(۱) بہ کدام فرصت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کشد
شبِ خوں بہ عمر خضر زنم کہ نفس شراب سحر کشد

اس شعر میں مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کارگاہِ عالم میں انسانی تگ و دو کی ہوس رانی حد درجہ حماقت ہے۔ کیونکہ انسان تو یہاں فرصت لے کر آیا ہی نہیں

اور بڑی سی بڑی فرصت و مہلت بھی حد درجہ مختصر ہے۔ پہلا مصرعہ
اتنی فرصت کہاں کہ اس چمن یا دنیا میں ہماری ہوس کوئی نتیجہ پیدا کرسکے۔ دوسرا مصرعہ

کیونکہ اس تنگی فرصت کا یہ عالم ہے کہ عمر خضر مل جاتے تو بھی وہ اس سے زیادہ کام نہیں دے سکتی کہ بمشکل ہم شام کو سحر کرسکیں

(۳) شکست زاں چشم فتنہ مائل غبار امکاں بہ بال بسمل
مباش زافسون سرمہ غافل ہنوز دستے ست زیر سنگش

محبوب کی چشم فتنہ پرداز کا یہ اثر ہے کہ بال بسمل سے غبار امکاں ٹوٹ گیا یعنی بسمل تڑپ کر رہ گیا اس لئے اس وقت سے غافل نہ ہو جب ان آنکھوں میں سرمہ بھی لگ جائے تو اس وقت خدا جانے وہ اور کیا قیامت ڈھائینگی سرمہ کے متعلق یہ کہنا کہ "ہنوز دستے ست زیر سنگش" صرف اس لحاظ سے ہے کہ تیار ہونے سے قبل وہ کھرل میں پیسا جاتا ہے

(۴) بہ کدام آئینہ مائلی کہ ز فرصت اینہمہ غافلی
تو نگاہ دیدۂ بسملی مژہ واکن و بکفن درآ

تو کس تماشے میں مصروف ہے کس آئینہ کے سامنے اپنی زیبائش اور آرائش میں لگا ہوا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی فرصت

تجھے ملی ہے وہ دیدۂ بسمل کی آخری نگاہ سے زیادہ نہیں۔ اس لئے آنکھ کھول اور کفن کے اندر آجا کہ تیری فرصت کا اقتضا اس سے زیادہ نہیں۔

(۴) ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما

چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

یہ شعر صاف ہے، مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق کی تمنائیں وصل محبوب کے باب میں اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر وہ محبوب سے کہتا ہے کہ ایک عمر گذر گئی تیرے ساتھ بادہ خواری میں مصروف ہوں، لیکن خمار محرومی اب تک نہیں گیا۔ خدا کے لئے بتا یہ کیا قیامت ہے کہ باوجود پہلو سے متصل رہنے کے بھی میرے پہلو سے جدا ہے۔ یا باوجود آغوش میں رہنے کے آغوش سے علیٰحدہ ہے۔

رومی کی مثنوی نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمناً بیدل کی مثنوی نگاری کا بھی تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔ نیاز صاحب اپنے ایک دوست کے خط میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

بندگان عالی ! مثنوی مولانا روم سے متعلق میری رائے آپ سے کیا ساری دنیا سے مختلف ہے۔ نظم و زبان کے لحاظ سے اس کا کوئی پایہ نہیں

اور معنوی حیثیت سے بھی مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی - کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق کا درس دینا پرانی چیز ہے - اور ہر قوم کے لٹریچر میں اس کا وجود پایا جاتا ہے لیکن وہ کتابیں جو کہانیوں کو حقیقت کے رنگ میں پیش کرتی ہیں میرے نزدیک سخت مضرت رساں ہیں اور انہیں میں سے ایک مثنوی مولانا روم بھی ہے - آپ دیکھینگے کہ جتنی حکایتیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں انہوں نے عوام کیا بعض خواص کی نگاہوں میں تاریخی اہمیت حاصل کرلی ہے - اور اس طرح ہمیں واہمہ پرست بنانے میں اس کتاب نے بھی بڑی مدد کی ہے -

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں جن روایات واحادیث سے استناد کیا گیا ہے وہ سب کی سب موضوع و ضعیف ہیں اور ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جب تک ضمیمانی رنگ نہ پیدا کیا جاتا جاہلوں کے لئے اس میں دلچسپی پیدا نہ ہوتی - لیکن کیا دلچسپی "افادیت" سے زیادہ مہتم بالشان چیز ہے - بہرنوع میری رائے میں یہ یکسر تخریبی لٹریچر ہے اور ان کا مطالعہ کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا -

رہگیا تصوف، سو اس میں شک نہیں کہ وہ اس رنگ سے خالی نہیں لیکن ایک IDEAL چیز ہونے میں مجھے بہت شک ہے، کیونکہ اس میں نہ

خیال کی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی گیرائی - اگر اس میں تاریخی ہستیوں کے متعلق غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا بلکہ بلا تخصیص افراد و واقعات عمومی طور پر محض مثالی انداز سے حکایتیں بیان کر دی جاتیں تو اس زہر کا نقصان بہت کم ہو جاتا، لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ ادبی خصوصیات کے لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے اور نہ معنوی خوبیوں کی حیثیت سے - سعدی کو میں ان سے بہت بلند سمجھتا ہوں اور عطار کو ان سے زیادہ دل چسپ - اور سچ پوچھئے تو مجھے عراقی بھی ان سے بہتر نظر آتا ہے -[۱]

زبان و خیال دونوں کی تکمیل اگر آپ کو دیکھنا ہے تو بیدل کی حکایتیں پڑھئے :-

ایک شخص نے کسی سنسان مزار پر شمع و پروانہ کو دیکھا، پروانہ کی حالت شمع کے گرد یہ تھی :-

کہ می گشت بیتاب گرد سرش	پرافشاں تراز دود بال و پرش
زبس پیکرش جا بجا سوختہ	زخود ہم چراغانے اندوختہ
ز ہر عضو پوسیدہ اعضائے شمع	سراپاش داغ و سراپائے شمع

---

[۱] رومی کے متعلق نیاز صاحب نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ محض ان کی انفرادی رائے ہے اس معاملہ میں مشکل سے ان کا کوئی ہمنوا ہوگا۔ "ع"

پروانہ کی یہ بیتابی اور یہ سوزانی دیکھ کر اس شخص نے پوچھا :-

نیائی چرا جانبِ انجمن   کہ فرش است صد رنگ و شمع و لگن

ز ہر گوشہ گل کردہ باغ دگر   ز ہر جام تاباں چراغِ دگر

نظر تا کنی عرضِ نقل است و مے   نفس تا کشی حرفِ چنگ است و نے

چراغے کہ سوزد بہ ویرانہا   وبال است بر بال پروانہا

اس کا جواب پروانہ نے جس انداز سے دیا وہ بھی ملاحظہ ہو :-

پر افشاند پروانۂ بے قرار   بروں ریخت از پردہ مشتے شرار

کہ پروانہ را کار با جمع نیست   مرادے جز اندیشۂ شمع نیست

بہ ہر جا چراغے برافروختند   دو عالم بہ چشمِ ترش سوختند

محال است بے طاقتِ سوختن   کند فرق ویرانہ از انجمن

بہ ویرانہ گر مدعا حاصل است   کرا ذوقِ آرائشِ محفل است

مولانا روم کے کلام میں بے خودی ضرور پائی جاتی ہے ، لیکن
CLIMAX اس میں بھی نہیں ہے ۔ بیدل کے سے ٹکڑے اس کے یہاں کہاں؟

مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟

(از حضرت سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ)

مرزا عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۳۳ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ ان کو طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرہ میں جس کو انہوں نے ۱۰۸۳ھ میں بیدل کی زندگی میں ایران میں بیٹھ کر ترتیب دیا لاہوری لکھا ہے بندرابن خوشگو جس نے بیدل سے ان کی آخری زندگی میں دلی میں بارہا ملاقاتیں کی ہیں، ان کو "اکبر آبادی الوطن" لکھا ہے۔ میر غلام علی آزاد جو بیدل کی وفات کے وقت ۱۷ سال کے تھے، اور جن کے سامنے خوشگو کا بیان موجود تھا،[1] اپنے تینوں تذکروں، ید بیضا، سرو آزاد، خزانۂ عامرہ میں ان کی جائے پیدائش تصریح کے ساتھ پٹنہ عظیم آباد لکھی ہے۔ سب سے عجیب بیان مجموعہ نغز کے مصنف میر قدرت اللہ قاسم کا ہے، جس نے اپنا تذکرہ

---

[1] اورینٹل لائبریری پٹنہ میں سفینہ خوشگو کا جو نسخہ ہے، وہ آزاد بلگرامی کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔

۱۲۲۱ھ میں ختم کیا ہے۔ اس نے بیدل کو بخاری المولد بتایا ہے۔ علی قلی ہدایت نے جس کا تذکرہ ریاض العارفین ۱۲۶۰ھ میں ترتیب پایا ہے، ان کو دہلوی لکھا ہے۔

ان بیانات پر نظر ڈالنے سے بیدل کے مولد و منشاء کی تعیین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیدل اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف شہروں میں اقامت پذیر رہے۔ اس لئے ہر ایک نے ایک مقام کی طرف انہیں منسوب کر دیا۔ بخاری المولد کہنا البتہ صحیح نہیں ہے کہ وہ ان کے آبا و اجداد کا مولد ہو تو ہو، مگر ان کا تو قطعاً نہیں۔ نصر آبادی کے اس بیان کی کہ بیدل لاہوری تھے، خوشگو نے اپنے سفینہ میں اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی، لیکن خود خوشگو کا یہ بیان کہ بیدل اکبر آبادی الوطن تھے۔ اس تصریح سے خالی ہے، اکبر آباد ان کی جائے پیدائش بھی تھی، ہو سکتا ہے کہ ان کے بزرگوں نے ترکستان چھوڑنے کے بعد اکبر آباد کو وطن بنایا ہو۔ لیکن بیدل کی پیدائش وہاں نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ ہر موطن کا مولد ہونا ضروری نہیں، ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ بیدل کا مولد و منشاء صوبہ بہار تھا جس کا دارالحکومت عظیم آباد پٹنہ تھا، اور ہے۔ اس دعوے کی شہادت میں میر غلام علی آزاد جیسے محقق کا بیان ہے جس نے تین تین جگہ اس کی تشریح کی ہے، ثانیاً

خود بیدلؔ کے اشارات ہیں۔ جن سے قیاس یہی چاہتا ہے کہ ان کا مولد و منشاء یا کم از کم ان کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گذرا ہے۔ چنانچہ میر غلام علی آزادؔ ید بیضا میں لکھتے ہیں —

"اصلش از قوم ارلاس[۵] در بلدہ پٹنہ متولد شدہ و بہ ہندوستان نشو و نما یافت۔"

سرو آزاد میں ہے —

"از نژاد قوم ارلاس است، در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از نہان خانۂ عدم بشہرستان وجود خرامید۔ و در ہندوستان نشو و نما یافت۔"

خزانۂ عامرہ کی عبارت یہ ہے —

"اصلش از گروہ ارلاس در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از شبستان عدم بہ صبح کدۂ ہستی در رسید و در بلاد ہندوستان نشو و نما یافت او در بنگالہ بیشتر بسر می کرد۔"

عبدالوہاب افتخار نے بھی اپنے تذکرۂ بے نظیر میں اپنے استاد آزاد کی

۵؎ ایک ترک قبیلہ

نے بھی انکو عظیم آبادی ہی کہا ہے۔

بیدل کی کچھ جوانی اور بڑھاپے کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا، اور وہیں وفات بھی پائی۔ اس لئے اگر کسی نے انہیں دہلوی کہا تو اعتراض کا موقع نہیں ہے۔ بیدل طریق سیاحت لاہور بھی جاتے رہے ہوں، جیسا کہ بابا حسن ابدال ان کا جانا تو چہار عنصر میں ہے، جس کے راستہ میں لاہور پڑتا ہے۔ لاہور کا آخری سفر اپنی وفات سے دو سال پہلے کیا تھا۔ ۱۱۳۱ھ میں سید سادات بارہہ نے فرخ سیر کے ساتھ زیادتی کی تو بیدل نے اسکی تاریخ "سادات بوئے نمک حرامی کردند" کہی اور اس کی شہرت ہوئی تو بیدل نے دہلی سے بھاگ کر لاہور عبدالصمد خاں ناظم لاہور کے یہاں پناہ لی اور سال دو سال کے بعد سادات کے فتنہ کے فرو ہونے کے بعد پھر دہلی لوٹ آئے اور وہیں ۱۱۳۳ھ میں وفات پاکر اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے۔ اس بنا پر اگر ایران میں ان کے قیام لاہور کی خبر پہونچی، اور وہاں کسی نے ان کو لاہوری لکھ دیا تو مغالطہ ہو سکتا تھا۔

اصل اختلاف بیان خوشگو اور میر غلام علی آزاد کے درمیان ہے، اور دونوں مصنفوں کا زمانہ بھی قریب ہے یعنی بیدل کی وفات کے وقت خوشگو جوان ہوں گے تو آزاد نوخیز۔ اس لئے ان دونوں کے بیانات میں تطبیق

یوں تطبیق ہو سکتی ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ خوشگو کے بیان کے مطابق بیدل اکبر آبادی الوطن اور آزاد کے بیان کے مطابق عظیم آبادی المولد تھے۔

یہ بات کہ پٹنہ ان کی جائے پیدائش تھی یا نہ تھی، خواہ مشتبہ ہی ہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انھوں نے بچپن کا ایک خاصا زمانہ پورب کے شہروں اور قصبوں میں گذارا، چنانچہ معتبر راوی خوشگو اپنے سفینہ میں لکھتا ہے:

"پس آں حضرت بطریق سیاحی رو بہ مشرق نہادہ، مدتے در حدود ممالک بنگالہ[1] و بہار و اڑیسہ بآزادگی و بے تعلقی بسر بردہ، دشت و بیاباں پیمودہ و عجائب قدرت الٰہی تماشا نمودہ۔ اکثر از خصوصیات آں ہنگام در چہار عنصر نگاشتہ خامہ اند و ہم دراں ایام بسیارے نعمت درویشی نیز نصیب او گردید۔ از آں جا بہ تکلیف پیر کلاں نگار بہ ہندوستان رسید۔ چندے بہ بلدہ اکبرآباد اقامت ورزید و بعد ازاں اتفاقاً بہ شاہجہان آباد رسیدہ کنج عزلت گزید۔"

خوشگو کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ بیدل ایک مدت تک پورب میں رہے۔

---

[1] بنگال۔

اس لئے ان کا عظیم آبادی مشہور ہونا بے اصل نہیں ہے۔ اب ہم اُنکی کتاب "چہار عنصر" سے ان شہروں کا پتہ لگاتے ہیں، جہاں جہاں ان کا قیام رہا۔ یا ان کی آمد و رفت رہی۔ اور اس سلسلہ میں خود ان کے کچھ ذاتی حالات بھی زیر قلم آئیں گے۔

بیدل صوفی منش اور مشائخ اور بزرگوں کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں "چہار عنصر" ان کے صوفیانہ ذوق و شوق اور نکتہ شناسی اور بزرگوں کی ملاقاتوں اور رباتوں کے تذکروں سے معمور ہے، بیدل کے والد قادری المشرب تھے۔ اور حضرت قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالےٰ کی روحانیت سے فیضیاب تھے اور عجب نہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالقادر اسی مناسبت سے رکھا ہو۔ بیدل لکھتے ہیں ۔

"تلقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت اک ذات مقدس آیات بود" (ص ۱۰۱)

بیدل کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا، باپ کا انتقال تو ان کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا، مگر چچا کا سایہ مدت تک ان کے سر پر رہا۔ اور انہی کی تربیت میں پل کر جوان ہوئے۔ اس لئے سپاہیانہ اور صوفیانہ ذوق ترکہ میں پایا۔

بیدل نے اپنے چچا کی شہزوری اور پرخوری ص ۳۳۲، اور اپنی شہسواری ص ۳۲۴ کے، اور خوشگو نے اپنے سفینہ میں بیدل کی پرخوری کے واقعات لکھے ہیں۔ جوانی میں اپنے صوفیانہ ورع و تقویٰ کی پردہ داری کے لئے سپاہیانہ ملازمت کا پیشہ اختیار کیا۔

بیدل کو بچپن سے تعویذ و عملیات کا شوق تھا، اور اس راہ سے وہ تصوف کے کوچہ سے آشنا ہوئے اور گو وہ موروثی طور سے قادری تھے، مگر اپنے علوم و معارف کے لحاظ سے ان پر نقش بندیت اور مجددیت کے اثرات غالب معلوم ہوتے ہیں، وہ اپنی نثر و نظم میں جو نکتے بیان اور جن حقیقتوں کو ظاہر کرتے ہیں وہ تمام تر وحدت شہود، ظہور اسمار وصفات، بے تعینی، فنا، تجرد، استغنار کے مضامین ہیں، جو ان کے اشعار و نکات میں جا بجا آتے رہتے ہیں۔

بہرحال سپاہیانہ طور سے مختلف صوبوں میں ملازمت کے خیال سے یا تجرد کے عالم میں بزرگوں سے ملاقات کے شوق میں وہ مختلف شہروں میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان کی مسافرت کا مغربی سلسلہ چہار عنصر کے تفحص سے بابا حسن ابدال کے قصبہ پر جو پشاور کے قریب واقع ہے، ختم ہوتا ہے۔ یہاں ان کے فیض تلقین سے ایک جوگی جو وحدت شہود کے مسلک میں ان کا ہم عقیدہ تھا،

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل ہو کر اسلام لایا ، اور
ان کی سیاحت کا مشرقی نقطہ اڑیسہ کا شہر کٹک ہے۔ جہاں اس زمانہ میں
نواب یعقوب پر ترقی کے پوتے تھانہ داران سید محمود صوبیدار تھے (ص ۳۴۹)

بیدل کے سفر کے مقامات میں مغرب میں بابا حسن ابدال اور پورب
میں اڑیسہ کے علاوہ زیادہ تر یوپی اور بہار کے شہر اور قصبے ہیں متھرا اور
ہردوار میں بھی کئی سال رہے ہیں ، اکبرآباد آئے گئے ہیں اور بہار کے مختلف
مقامات میں ان کی آمد و رفت رہتی ہے۔ مگر ان تمام مقامات پر استقرار
کی نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بچپن سے جوانی تک اُن کا تعلق
زیادہ تر بہار سے رہا۔ اور جوانی سے بڑھاپے تک اور آخر زمانہ دہلی میں گزرا۔

اوپر گذر چکا ہے کہ ان کے والد اور چچا قادری المشرب صوفی تھے۔
تربیت بھی ان کو بہار ہی میں ایک شیخ وقت سے ہوا۔ بیدل نے عنصر اول
میں اپنی ظاہری و باطنی ابتدائی تعلیم کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

" ساڑھے چار ہی برس کے تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی۔ ماں نے اپنے
بچہ کو پانچویں سال، چھٹے مہینے رجب میں پڑھانے کو بٹھایا۔ دسویں
برس کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے فارسی نظم و نثر اور عربی
صرف و نحو کی کتابیں تمام کیں۔ اور یہی ان کی رسمی تعلیم کی آخری

حد ہے۔ اس کے بعد جو کچھ پایا وہ معلم فطرت کی تعلیم کا نتیجہ ہے"۔ (ص ۳۰۰، ص ۱۰۱ٔ)

اس ظاہری تعلیم کے اختتام کے بعد ہی وہ صوبہ بہار کے ایک بزرگ شاہ کمال قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچ گئے، جو ان کے والد اور چچا کے پیر تھے۔ (ص ۳۰۱)

یہ بزرگ کہاں رہتے تھے، بیدل کے بیان سے صاف نہیں معلوم ہوتا، مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرائے بنارس بہار میں ایک مقام تھا، یہاں ان کا قیام تھا۔

"سرائے بنارس موضع است از نواح ممالک بہار" (ص ۳۰۷)

سرائے بنارس نام کا کوئی مقام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"مرزا قلندر را کہ چندے در قصبہ رانی ساگر کہ بہ یمن توطن مولانا شیخ کمال افتخار مدینۃ الاولیا داشت، اتفاق اقامت بود ...... از بنارس تا رانی ساگر فرسنگے بیش نہ بود"۔ (ص ۳۰۷)

یہاں چھپا ہوا بنارس ہے، مگر غالباً صحیح سرائے بنارس ہے۔ جس کا ذکر پہلے گذرا۔ مرزا قلندر رانی ساگر جا کر شیخ کے پاس ہفتوں مقیم رہتے تھے (ص ۳۰۴)

رانی ساگر میں خوشنما تالاب تھا (ص ۴۰۳)

بیدؔل شیخ کمال کی صحبتوں سے آغازِ شباب ہی سے مانوس تھے اور چچا کے ساتھ اس بارگاہ قدس میں پہنچے تھے اور ان کے معارف و حقائق سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ (ص ۳۱۵)

رانی ساگر صوبہ بہار میں آرہ شاہ آباد سے اٹھارہ میل اور پٹنہ سے پچاس ساٹھ میل پچھم اب بھی آباد ہے اور تالاب بھی موجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بیدؔل کے باپ اور چچا نے تلقین کا فیض پایا، اور بیدؔل کے دل و دماغ نے وہاں سے آبیاری پائی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ بیدؔل کا مولد اگر پٹنہ نہ بھی ہو تو ان کا منشاء یعنی ان کی ابتدائی نشوونما کی جگہ بہار ہی کا کوئی مقام ہے۔

شاہ کمال قدس سرہٗ سے ایک اور ملاقات کا ذکر بہار کے قصبہ آرہ میں، جو اب ضلع ہے، بیدؔل نے کیا ہے۔

"ذرایا مے کہ قصبہ آرہ اقامت کردہ امر اتفاقی بود، اویم افسردہ زمین بہل قدمش رائحہ سعادت می اندوخت" (ص ۳۱۹)

دوسرے حلقۂ شوق کے ساتھ مرزا قلندر بھی شاہ صاحب کے ہمرکاب تھے۔

"حضور مرزا قلندر کہ ذرہ ہر بنِ موے زبانے داشت، مرہون

ستایش بکاتش و در ہر جنبش نفس بیانی معروف تذکرہ احوالش"

(ص ۳۱۹)

۱۰۷۰ھ میں جس سال شاہ شجاع نے شاہ جہاں کی بیماری کے زمانہ میں بنگال اور بہار میں اپنی سلطنت کا علم کھڑا کیا، بیدل پٹنہ میں یا پٹنہ کے پاس ہی کہیں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں اس ملک کی جو کیفیت تھی اور آس پاس کے راجے اور زمیندار جس طرح ملک میں ہنگامہ برپا کر رہے تھے اور اس سے ملک میں جو بدامنی پیدا ہو رہی تھی اور راستے جیسے خطرناک ہو گئے تھے، اس کا پورا حال "عنصر چہارم" میں کئی صفحوں میں لکھا ہے، اور صوبہ بہار اور پٹنہ کا حال جس طریقہ سے لکھا ہے، اس میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صوبہ سے پوری طرح آشنا تھے اور یہاں کے نہ صرف شہروں بلکہ گاؤں سے بھی واقف تھے، بلکہ کہیں کہیں جاکر رہے بھی تھے۔ لکھتے ہیں۔

" سالے کہ شاہ شجاع بن شاہ جہاں بیماری پدر اسکہ مضمون سلطنت اندیشیدہ از خطۂ بنگالہ تا سرحد ممالک بہار ......
از آں جملہ تسخیر نواح ترہت کہ شمالی حدود پٹنہ ملکے است عظیم و کوہستانی مشتمل بر چندیں قصبات۔" (ص ۱۵۱)

شاہ شجاع کی طرف سے بیدل کے چچا مرزا قلندر کے ایک عزیز مرزا

عبداللطیف ترہت میں فوج کے افسر تھے۔ (ص ۵۵۱) بیدل بھی ترہت میں کہیں رہ نوردتھے۔ ایک مقام پر پہونچے، جس کا نام "چپانہ پور" بتایا ہے اور وہاں کے عجائبات خیالی کا ایک واقعہ حوالہ قلم کیا ہے (ص ۵۵۴) اور آخروہ کسی طرح،

"بسواد امن پٹنہ رسید"۔ (ص ۵۵۴)

ایک اور موقع پر پٹنہ کا ذکر کرتے ہیں۔

"دربلدہ پٹنہ وفاق معارف اتفاق مرزا ظریف" (ص ۵۵۵)

پٹنہ سے پچاس ساٹھ کوس دریائے گنگا کے اس طرف مظفرپور اور موتیہاری کے بیچ میں جسی کا نام کا ایک قصبہ تھا جو اب بھی ہے۔ اس قصبہ میں بیدل کے چچا مرزا قلندر کبھی سکونت پذیر تھے اور مرزا بیدل انکے ساتھ تھے۔ ۱۰۶۸ھ میں جب شاہ شجاع کا ہنگامہ سرد پڑرہا تھا، مرزا قلندر نے اسی جسی کے راستہ سے بنگال کا رخ کیا اور اپنا سامان و اسباب یہیں چھوڑ دیا۔ (ص ۵۶۶)

جسی میں اس وقت کوئی بزرگ خواجہ شاہ محمد تھے۔ ان کے تابعوں میں جوان محمد تھے۔ انہی کے پڑوس میں مرزا قلندر کی سکونت تھی۔ (ص ۵۶۶)

اسی بدامنی کے زمانہ میں بیدل کو اس قصبہ میں جانے کی ضرورت

پیش آئی - (ص ۵۶۶) جمعیت کے بجائے تنہا ایک ملازم کو لے کر پا پیادہ چل پڑے - پا پیادہ چلنے کی عادت نہ تھی، راہ میں بے حد تکلیف ہوئی - گنگا سے پار اُتر کر تین کوس ہی گئے تھے کہ تھک گئے - کسی طرح جمنا پور تک پہونچے، پھر تین کوس اور چلے تھے کہ بالکل بے بس ہو کر پڑ گئے - اتنے میں دیکھا کہ ایک پیر مرد ایک گھوڑی پر سوار سامنے آئے - قریب آ کر بڑی گرمجوشی سے سلام کیا، اور اس تباہ حالی کے ساتھ سفر کا سبب دریافت کیا - بیدؔل کے وہ پرانے ملنے والے تھے، مگر بیدؔل ان کو پہچان نہ سکے - انہوں نے کہا ــــ

"من جان محمدم از تابعان خواجہ شاہ محمد کہ در تھسی با مرزا قلندرش نسبت ہمسائگی دیوار بدیوار است" (ص ۵۶۶)

انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ بیدؔل کو اپنی گھوڑی پر سوار کیا اور خود پیادہ ساتھ ہوئے اور دونوں تھسی کی طرف چلے -

لوگوں کو بیدؔل کی آمد کی خبر ہوئی تو سب خوش ہوئے -

"فردائے آں کہ پسرانِ خواجہ برسمِ قدیم صحبتِ فقیر دریافتند" (ص ۵۶۹)

ان لفظوں کو پھر پڑھیئے کہ خواجہ صاحب کے لڑکوں نے رسم قدیم کے

معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا

نہ سمجھا میں کہ اس پردہ میں تو تھا

بیدلؔ کے دیوان میں اس مسلک کی وضاحت کے لئے بعض اور اشعار دیکھئے:

شش جہت آئینہ دار شوخی اظہار اوست

نیست جز مژگاں حجابے را کہ بر داریم ما

حسن[۵۱] مطلق داشتم خود بینیم آئینہ کرد

ایں قدر با ہم اثر بیہودہ است اوہام را

حیرت نگاہِ شوکتِ نومیدیٔ خودم

کایں ہفت عرصہ یک کفِ بے دستگاہِ اوست

اے غفلت آبروئے طلب بیش ازیں مریز

عالم تمام اوست کرا جستجو کنند

دریاست[۵۲] قطرۂ کہ بہ دریا رسیدہ است

---

۵۱ غالبؔ نے اسی خیال کی یوں ترجمانی کی ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

۵۲ غالبؔ کے یہاں دیکھئے :۔ ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

...... اگلے لوگوں سے سُنا ہے کہ مرزا محلہ ٹپن ڈیوی میں رہتے تھے لیکن کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔" (ص ۲۴۰)

"چہار عنصر" میں میری تلاش میں دو دفعہ اکبر آباد کا ذکر آیا ہے۔

" در بلدۂ اکبر آباد منظور ابرار امیر کامگار کہ بدلیل سعادت ازلی اوقات گرامی مصروف خدمت فقرار داشت و در احترامیکہ لائق ایں طائفہ است ...... بہ حکم حسن اعتقاد فقیر را نیز ازیں فرقہ تصور فرمودہ۔" (ص ۴۹۲)

دوسرا موقع۔

" تابستانے در گوشۂ از زوایائے اکبر آباد گرمی ہائے صحبت تنہائیم، بساط عافیت پرداختہ بود" (ص ۵۴۹)

مگر اُن کے ان فقروں میں سے کسی سے بھی بوئے وطن نہیں آتی۔

اقبال اور بیدل

اقبال کے ذہنی اور فکری ماخذات کا سلسلہ بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ متفکرین، شعراء، صوفیا، فقراء، مفسرین، مورخین کے خیالات اور افکار سے خوشہ چینی اور استفادہ کی مثالیں اُن کے کلام اور نظام فکری میں جا بجا موجود ہیں۔ اس منزل میں جن راہبروں نے اقبال کی رہنمائی کی ہے ان میں ایک مرزا عبدالقادر بیدل بھی ہیں۔ اقبال نے مولانا روم کو جا بجا اپنا پیر و مرشد اور ہادی و رہنما بتایا ہے، پیر رومی کے علاوہ کم اور لوگ ایسے ہیں، جنہیں اقبال نے اس اعزاز کا مستحق سمجھا ہے اور ان میں ایک مرزا بیدل بھی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ — ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا — ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی — اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام — ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور — مجھ پر کیا ہے مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است   ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش [1]

آخری شعر مرزا بیدل کا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال صرف بیدل کی شاعری، اُن کے مخصوص انداز بیان یا طرز ادا سے ہی متاثر نہیں ہوئے ہیں ۔ بلکہ اُن کے فلسفۂ حیات کے بھی قائل ہیں ۔

بیدل ایک صوفی مشرب مفکر تھے [2] ۔ ان کے خاندان کے شیخ طریقت مولانا شیخ کمال قادری تھے ۔ بیدل کے چچا مرزا قلندر جنہوں نے بیدل کے والد کی وفات کے بعد اس یتیم بچے کی پرورش کی تھی شیخ کمال کے مرید تھے اور انہیں کے ساتھ بیدل شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ بیدل نے اس زمانے کے حالات "چہار عنصر" میں بیان کئے ہیں ۔ اُن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بیدل اسی زمانے سے سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے تھے ۔ ان کے علاوہ شاہ ملوک ایک بزرگ تھے ۔ بیدل نے ان کی بہت سی کرامتوں کا ذکر کیا ہے، جن سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ملوک کا مسلک وحدت وجودی تھا ۔ اور ایک موقع پر انہوں نے مثنوی کے یہ اشعار بیدل کو سنائے تھے :۔

---

[1] دیکھئے اُردو میں بھی یہ خیال ذرا مختلف انداز میں یوں آیا ہے :۔
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل   لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

[2] "بیدل"، از خواجہ عباد اللہ ص۱۷

ایں توئی ظاہر کہ پندار توئی   ہست اندر توئی تو از بے توئی

توئی تو از دیگرے آید و فیں   من غلامِ مرد خود بینِ چنیں

شاہ ملوک کے ذکر میں بیدل نے فقر کی تعریف اور فقیر کی شان میں یہ شعر لکھے ہیں :-

اے بسا روشن دلے کز بے نیا زیہائے شوق
چوں فروغِ مہر بر خاکِ سیاہ افتادہ است

اے بسا آئینہ کز کسوتِ زنگاریش
یوسفستانے بخلوت گاہِ چاہ افتادہ است

معنیٔ اقبال فکر از غافلاں پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است

ہر کجا گردِ شکستے سرمہ آراید بچشم
بے تامل نگزری آنجا کلاہ افتادہ است

عالمے محمل بدوشِ وہم جولاں می کند
کیست تا فہمد کہ منزل ہم براہ افتادہ است

اقبال کے یہاں صاحبِ نظر فقیر، قلندر یا مردِ مومن کی جو تشریح ہے وہ اسی بیان کی تشریح ہے۔

تیسرے بزرگ شاہ فاضل ہیں جن کا ذکر بیدل بڑی عقیدت اور جذبے کے ساتھ کرتے ہیں ۔ سترہ سال کی عمر میں بیدل کو شاہ ابوالقاسم ترمذی کا فیض صحبت نصیب ہوا ۔ ان کے متعلق بیدل لکھتے ہیں :-

ع بودیم آنچہ بودیم ، اُو وا نمود مارا

دہلی میں بیدل کو ایک اور مجذوب سے واسطہ پڑا جن کا نام کوئی نہیں جانتا تھا ۔ لیکن سب شاہ کابلی کہتے تھے ۔ ان کے کشف و کرامات کے بہت سے واقعات بیدل نے بیان کئے ہیں ۔ غرض بیدل کی تربیت اور سارا ذہنی نشو و نما انہیں بزرگوں اور صوفیوں کی صحبت کا مرہونِ منت ہے ۔ اور ان کا تصوف محض رسمی ، تقلیدی یا کتابی نہیں ہے ۔ بلکہ رائج اور رسمی تصوف کے بارے میں ان کا رد عمل اس شعر سے واضح ہو جاتا ہے ۔

ے درمزاجِ خلق بے کاری ہوس می پرورد
غافلاں نامِ فضولی را تصوف کردہ اند

یعنی ایسا تصوف جو مزاجِ خلق میں ہوس کی پرورش کرے ، جو قومی کے اضمحلال کا باعث ہو ۔ جس سے زندگی میں افسردگی یا پامالی کو فروغ ہو اور جو انسان کو زندگی کے مشاغل اور گہما گہمی سے دُور لے جائے ، ایک فضول مسلک ہے ۔ جسے غافلوں نے تصوف کا خوبصورت نام دے رکھا ہے ۔ بیدل کا

یہی رجحان ہے۔ جس نے انھیں متاخرین ہندی صوفیاء سے ممتاز کیا ہے اور جس نے اقبال کو ان کا گرویدہ بنایا ہے۔

بنیادی طور پر بیدل بھی صوفیاء کے ایک طبقہ کی طرح وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ مختلف تصانیف میں بے شمار اشعار اس مسلک کی تائید میں ملتے ہیں۔

عالم ہمہ یک جلوۂ ذاتِ احد است
ایں جا نہ ہیولیٰ نہ صور نہ جسد است
کثرت آثار چشم وا کردن است
ایں صفر چوں محو شد، ہماں یک عدد است

تخلیق کائنات میں "عدد" کی اہمیت کو سب سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح کے یونانی حکیم فیثا غورث نے واضح کیا تھا۔ لیکن اس کے یہاں مکمل ترین عدد "چار" ہے اور وہ کائنات میں "دوئی" کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک حیاتِ حیوانی کے علاوہ کائنات میں مختلف صورتوں اور شکلوں میں حیات پائی جاتی ہے۔ اور یہ حیات اپنے مکمل یا نامکمل ہونے کے اعتبار سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال بیدل کی اس رباعی میں وحدت وجود کے مسئلہ کو ایک لطیف پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

کہ اصل حقیقت ایک "اکائی" ہے۔ "واحد" ہے۔ ہیولیٰ، صورت اور جسد دراصل صرف "عکس" یا "جلوہ" کا نام ہے۔ پھر سوال ہوگا کہ یہ کثرت کیوں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ 'صفر' کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی، لیکن 'اکائی' پر اسی صفر کا اضافہ ہو تو 'دس' کا عدد بن جائے گا۔ پھر اسی طرح صفر بڑھاتے چلے جاؤ۔ سو، ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کروڑ غرض جہاں تک چاہو بڑھتے جاؤ۔ پھر صفر نکالنا شروع کرو، آخر میں اکائی رہ جائے گی۔ جب ہم آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں تو آنکھ جو 'صفر' کی صورت ہے وحدت میں کثرت کے جلوہ کا باعث بن جاتی ہے۔ اگر آنکھ بند کرلیں تو یہ 'صفر' محو ہو جائے گا اور پھر ایک اکائی باقی رہ جائے گی۔

بیدلؔ نے وحدت اور کثرت کے اس تعلق کو بار بار اسی طرح سلجھایا ہے:۔

به شوخی بر نمی آید دماغِ نازِ یکتائی
من از حیرت فزودم صفر بہ اعدادِ نیرنگش

یا ۔

وا کردنِ چشم اینقدر رم دہ ولہ دارد
بیدلؔ بہ ہمیں صفر فزودست حسابم

مثنوی "محیط اعظم" میں اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے :-

توئی قبلۂ خود چو محرم شوی | تو محراب خویشی اگر خم شوی
درین گنبدِ بے درِ آسماں | ز بیگانہ تا چند جوئی نشاں
بچشمِ تو نقشے سوائے تو نیست | بگوشِ تو غیر از صدائے تو نیست
بوہم وگماں ہرچہ پیچیدۂ | چرا خویش را غیر فہمیدۂ
گمانِ عدم، وہم ہستی ز تست | خمار از تو، سر جوشِ مستی ز تست
ز جائے دگر نیست ایں گفتگو | توئی نشأ غفلت و جستجو
یکے ہمچو خم در گریبانِ خویش | نظر کن ببیں جوشِ طوفانِ خویش
ز شورِ تو ایں بزم دارد خروش | ز خاموشیٔ تست عالم خموش
طلسمِ جہاں پردۂ سازِ تست | تہی از خود و پر ز آواز تست
چہ وا ماندۂ در غمِ این و آں | طلسم خیالی است نقش جہاں

یہ وہی خیال ہے جو اُردو میں صوفی شعراء مدّت تک پیش کرتے رہے ہیں۔ میر کے اشعار دیکھئے :-

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

مطابق بیدل سے ملاقات کی اور صحبت رہی۔ رقعات بیدل کے آخر میں
ایک رقعہ بہار کے کسی بزرگ کے نام کا ہے۔ جس کا آغاز ان لفظوں سے
ہوا ہے۔

" نعیم عیش صوبہ بہار مبارک باد قبلہ از روے بیدلاں
ہر چند عبودیت قدیم بہ ہیچ جاے از ادائے خدمات
سر بر نمی آرند "

ان اقتباسات اور حالات سے ظاہر ہوگا کہ بیدل کو صوبہ بہار سے
موروثی تعلق تھا اور اگر اسکو عظیم آبادی کہنے میں تامل ہو تو بہاری کہنے
میں مطلق تامل نہیں۔ اور اکثر قصباتی لوگ بہاری کے بجائے عظیم آبادی
کہلاتے ہیں۔

آخر میں عظیم آباد پٹنہ کے شرفا کی زبان پر بیدل کے متوطن عظیم آباد
ہونے کی جو کہانی سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہے۔ ہم اس کو ذکر کرتے
ہیں۔ شاد عظیم آبادی اپنی تاریخ "صوبہ بہار" میں جس کو انہوں نے لکھا ہے
" مرزا عبدالقادر متخلص بیدل خاص عظیم آباد پٹنہ کے متوطن تھے۔
ناقدر دانی ابنائے روزگار کے سبب سے وطن کو چھوڑ کر عہد دولت
شاہجہاں میں دہلی گئے اور وہاں نہایت معزز و مکرم ہوئے ....

بجز ما کسِ دگر نتواند بما رسید
محیط است چوں محو گردد حباب
ز خود گم شدن جزو را کل کند[1]
پیشتر ز آشوبِ کثرت وحدتے ہم بودہ است
یاد آں موجیکہ در بیرونِ ایں دریا زدیم

اس قسم کے اشعار میں بیدل کی آواز اُن بے شمار صوفیا کے ساتھ مل جاتی ہے۔ جنہوں نے وحدت وجود کے عقیدہ کے لازمی نتیجہ کے طور پر نقش جہاں کو طلسم خیالی سمجھا تھا۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو بقول اقبال "بود را نابود گفت" کی تفسیر ہے۔ اس لئے شاید پہلی نظر میں یہ تعجب ہو کہ اس مسلک کے باوجود بیدل کیوں کر اقبال کے مرشد کامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسے بعض لمحات اقبال پر بھی گذرے ہیں۔ جن کو صوفیانہ تجربات (MYSTIC EXPERIENCES) سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایسے عالم میں اقبال کو بھی یہ سارا عالم محض ایک طلسم و مجاز۔ آسمان محض ایک ردائے نیلگوں اور یہ دُنیا محض جہانِ آب و گِل نظر

---

[1] پھر غالب سے سنئے:۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

آئی تھی - دوسری بات یہ ہے کہ اقبال نے بیدل کے فلسفہ اور حرکت سے جو اثر قبول کیا ہے وہ اس مسلک میں نہیں ہے - بلکہ بیدل کے یہاں انسان کی عظمت، رہبانیت کے خلاف ردعمل، علم کی حقیقت، اصل معرفت، عقل اور جنون، خودداری، خودنگری اور خودشناسی اور سب سے بڑھ کر جد و جہد اور تب و تاب کے جوگہرہائے نایاب ہیں، اقبال انہیں کے خریدار ہوئے ہیں - اور اسی متاعِ بے بہا سے انہوں نے اپنی دوکان سجائی ہے -

بیدل کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "کل کائنات کلمات ہیں"[1] -

قل لو کان البحر مداد الکلمت ربی الایہ (کہف - ع - ۱۲)

نفس در عبارات حرف ست و بس
بہر رنگ آیات حرف ست و بس

چو بے پردہ شد حرفِ پیراہن است
حقیقت کہ آں سوئے ما و من است

کہ آخر در انسان نمودار شد
چہ مقدار بیتاب اظہار شد

تمام کائنات ایک کتاب ہے - حروف ہیں یا کلمات ہیں، اشیائے کائنات یا ان کے تصورات جو ہمارے قلب میں ہیں - اور جن کو ہم خیالات سے موسوم کرتے ہیں - فی الحقیقت حروف ہیں جن کے ذریعہ اشیائے کائنات ہم سے

---

[1] "بیدل" خواجہ عباد اللہ - ص ۳۲

ہمکلام ہوکر اپنا مافی الضمیر واضح کرتی ہیں۔ کتاب کائنات کا مصور ہے اور یہ تصویری حروف یعنی اشیا کی صورتیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں" "یہ کائنات عالمِ غیب وشہادت ہے۔ عالم غیب میں یہی سخن حقیقت ہے اور شہادت میں مجاز سے موسوم ہے۔" .... یہی حقیقت جمادات میں خاموش ہے اور نباتات میں نفس اور حیوانات میں آواز اور انسان میں لغات کی صورت میں مشاہدہ ہوتی ہے، دنیا کیا ہے ؟ اس کے سخن کے الفاظ کی صورت، عقبی کیا ہے ؟ اسی کے معنی کا مشاہدہ .... اسی سے جہان زندہ ہے۔ اور یہی روحِ کائنات ہے۔" [۵۱]

یہ اور اسی طرح کے مسائل اقبالؔ کے فکری نظام سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اور بیدلؔ کے کلام میں ایسے عناصر موجود ہیں جو اقبالؔ کے کلام اور اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہیں۔ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلام کے خلاف بعض نئی تحریکات خود مسلمانوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان مسلمانوں میں ترکی شاعر توفیق فطرت بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی اس تحریک کی تائید کے لئے مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا سہارا لیا ہے۔[۵۲] لیکن ان مسائل سے

---

[۵۱] "بیدلؔ" خواجہ عباد اللہ۔ ص۱۹۱ [۵۲] "خطبات" ص۰

ہٹ کر اقبال اور بیدل میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً صوفی ہونے کے باوجود بیدل متاخرین متصوفین کی طرح اپنے آپ کو شرع کی حدود اور پابندیوں سے آزاد نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے جو باوجود قدرتِ عمل، بیکاری اور کاہلی اور تن آسانی اختیار کرتے ہیں یا دیوانہ بنتے ہیں کہ تکالیف شرعیہ سے معذور سمجھے جائیں۔ بیدل اپنے پیر و مرشد مولانا شیخ کمال الدین کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں :۔

تا نہ گردند خاکِ جادۂ شرع
گر ہمہ منزل اند گمراہ اند

اس سے ظاہر ہے کہ بیدل کے نزدیک صوفیاء کا اسلام کوئی الگ چیز نہیں اور نہ شریعت اور طریقت کوئی ایسے دو راستے ہیں، جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں۔ یہیں سے بیدل کا صوفیانہ مسلک اکثر متاخرین ہندی صوفیا کے عام رنگ سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ریاضتِ جسمانی کی بحث آتی ہے۔ بیدل کہتے ہیں :۔

گر عین و گر اقتباس دریافتہ   در انجمنِ حواس دریافتہ
بر دامنِ جسمِ پاک، تحقیر مدوز   حق را بہ ہمیں لباس دریافتہ

"نکات" میں اس کی وضاحت نثر میں یوں کی ہے :۔

"ریاضت صفائی باطن می آرد بشرط اعتدال، و ضعف برقویٰ می گزارد با فراط کمال، مدعا ازیں موادِ فاسدہ را باصلاح آوردن است نہ اجزائے صالح رانیز فاسد کردن ۔ ایں جا زنگار از طبیعت زدودن است نہ آئینہ بہ مشق صیقل فرسودن۔ بحکمِ قدردانی وجود از انبیاء ہیچ کس بہ ریاضات شاقہ نساخت الّا بقدر اصلاحِ مزاج و بخورد خور نیز نپرداخت مگر بمقدار ضرورت احتیاج ۔"

بنیاد جسد کہ کارگاہ اسماست
رونے دوز حکمتِ طبیعی برپاست

بر صوم و صلوٰۃ برمیفزا کاینجا
تعدیل بہ ہر امر کمالِ عرفاست

بیدؔل جو 'جسد' اور 'جسم' کا اتنا احترام کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے "عظمتِ آدم" کے کیونکر منکر ہو سکتے تھے ۔ اس احساس کی ترجمانی دیکھئے :۔

انساں کہ فلک ہاست سر افگندۂ او
در حیرتِ او گم است دانندۂ او

دارد خیالے کہ درخارج و ذہن
ہر چیز کہ آفریدہ شد بندۂ اوست

ہر چیز جو پیدا کی گئی، انسان کی غلام ہے۔ عظمتِ آدم اور منصب آدم کا یہ وہی نغمہ ہے، جس کی بازگشت ہمیں "اسرار و رموز" اور اقبال کے سارے کلام میں ملتی ہے ۔ بیدؔل کے کچھ اور اشعار ہیں :۔

طالبِ صحبتِ معنی نظراں باید بود
خاک در صحن بہشتے کہ نہ دارد آدم !

اصل چیز صاحب ادراک اور اہل نظر کی صحبت ہے، اسی کا طالب ہونا چاہیئے۔ جنّت جس میں حوریں ہیں، زمرد اور جواہر کے قصر ہیں، دُودھ اور شہد کی نہریں ہیں۔ اگر آدم وہاں نہ ہو تو خاک ایسی جنّت پر !

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش

یہ وہی مفہوم ہے جسے میرؔ نے اپنے تیکھے انداز میں اس طرح ادا کیا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

اور اقبالؔ کا یہ شعر ؎

آیۂ کائنات کا معنئ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

عافیت دور است از نقشِ بنائے عمرِ ما
خوں بود رنگے کزو تصویرِ انساں می شود

مدعا دل بود اگر نیرنگ امکاں ریختند
بہر ایں یک قطرۂ خوں رنگِ طوفاں ریختند

متاع ہستیٔ دارم مپرس از بود و نابودش
بصد آتش قیامت می کنی گر واکنی دودش

"نکات" میں حقیقتِ کائنات بیان کرتے ہوئے بیدلؔ نے منصب آدم کی وضاحت یوں کی ہے۔

آں نغمۂ بے نشانی پردۂ راز
کہ انساں ز نوائے اوست مخرج پرواز
در آئینۂ جماد موجِ رنگ است
در طبع نبات بوئے، حیواں آواز

آتش در طبع جماد برق آں حقیقت است چراغ افروز خلوت خانہ غیب، و ہوا در مزاج نبات نفس زدن آں اسرار یعنی ریاحین ارواح بے شبہ و ریب، صدا در طینتِ حیواں نمو و متالش در تمہید عرض مراتب و مدارج، و سخن در ذات انساں شہود نمائش کسوت آرائے دستگاہِ مخارج، پس آفاق معمائے سخن است فاماّ نا مفتوح و انسان عبادتِ آں در کمال تصریح و وضوح، ہرگاہ تامل انسان کہ گریبان اسرار موالید و عناصر است

زانوئے خیال باطن و ظاہر بہ تحقیق آں نفس تو جہ کمار د نقاب جمیع مراتبش از نفاتس مو ہومہ خود برمیدارد یعنی نفس انسانی در جہان نیرنگی مادّہ ظہور اسمار است۔

بہر رنگ آفاق حرفست و لیں	نفس در عبارات حرفست وبس
حقیقت کہ آنسوئے ما و منست	چو بے پردہ شد حرف پیراہنست
چہ مقدار بیتاب اظہار شد	کہ آخر در انساں نمودار شد
بہ تحقیق خویش است پیچید نش	در انساں نمودار گر دیدنش

ایک غزل کا مقطع ہے :۔

زحسد نمی رسی اے دلی بعروج فطرت بیدلی
تو معلم ملکوت شو کہ نہ حریفِ کمالِ او

ایک دوسری غزل کے دو شعر ہیں :۔

بیخبر از خود مگذر جانب دل ہم نظرے
اے چمنستانِ جمال آئینہ دارد سحرے
نیست دریں ہفت چمن چوں قلت اے غنچہ دہن
گلبنِ نیرنگ گلے، سروِ قیامت ثمرے

وہ آدم جس کا یہ منصب ہے۔ جو اس عظمت کا حامل اور اس دولت

آئین ہے۔ جو سلسلۂ کائنات میں ارتقا کی ایک بلند کڑی ہے۔ خود جد وجہد اور تب و تاب کا پتلا ہے۔ بیدل کے فلسفہ میں حرکت اور عمل کا بھی پہلو ہے جس نے اقبال کو ان کا مرید بنا لیا ہے۔ بیدل کا ایک شعر ہے :-

موج دریا را بساحل ہمنشینی مشکل است

بیقراراں تندیر منزل کردہ اند آرام را

اسی کی بازگشت اقبال کے ان اشعار میں دیکھئے :-

ساحلے افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم

ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

بیدل نے نئے نئے انداز سے اس خیال کی ترجمانی کی ہے :-

مرا از پیچ و تاب آرزو ایں نکتہ روشن شد

کہ در راہِ طلب معراج داماں است چیدن ہا

گر ہمہ بر خاک پیچد عشق، حسن آرد برون

کوشش فرہاد آخر کرد شیریں سنگ را

مقام وصل نایاب است راہِ سعی ناپیدا

چہ می کردیم یارب گر نبودے نارسیدن ہا

اس مصرع میں جس انداز سے نارسائی کی دولت اور کرامت کا ذکر ہے، اس کا عکس اقبالؔ کے یہاں بھی بار بار ملتا ہے۔ فراق سے عشق کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وصل اس کے لئے پیام مرگ ہے۔ بیدلؔ لکھتے ہیں :-

ز وصل مدعا سعیٔ طلب مایوس می گردد
بہ بیکاری رساند التیامِ زخم مرہم را

سایۂ دور از آفتاب مغتنم خود است و بس
طالب وصلِ او شدن صرفۂ من نمی کند

چو تخم اشک بکلفت سرشتہ اند مرا
بہ نا امیدیٔ جاوید کشتہ اند مرا

طلسمِ حیرتیم یک نفس قرارم نیست
بہ آبِ آئینۂ دل سرشتہ اند مرا

یہی بیقراریٔ پیہم اقبالؔ کے فلسفۂ حیات و حرکت کی جان ہے -

فلک شکار کمند است سرنگونیٔ من
ندانم از خمِ زلف کہ رشتہ اند مرا

پہلا مصرع اقبالؔ کے یہاں کتنا شوخ اور نکھرا ہوا ہے —

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ[1]

بیدلؔ ایک شعر میں تن آسانی سے نفرت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :۔

داغِ شوقم، نیست الفت با تن آسانی مرا
پیچ و تابِ شعلہ باشد نقشِ پیشانی مرا

طارق فاتح اندلس نے ساحل پر اُترنے کے بعد اپنا سفینہ جلا دیا تھا، کہ سفینہ کی موجودگی شاید فرار کا سہارا بنتی یا ارادے میں اضمحلال پیدا کرتی، سفینہ جل گیا تو پھر فتح یا شہادت دو ہی صورتیں رہ گئیں۔ اقبالؔ نے اسی واقعہ کو ایک نظم کا موضوع بنایا ہے۔ بیدلؔ نے بھی 'شکستنِ کشتی' کو ہی 'ساحل امن' قرار دیا ہے :۔

بجز کشتی شکستن ساحلِ امنے نمی باشد
کہ از وسعت فرو بردہ است ایں دریا کرانہا

موج ساحل کی علامتیں بیدلؔ کے یہاں بار بار آتی ہیں۔

انجمن در بغلِ ما ہمہ بیروں دریم
بحر چندانکہ زند موج کنار ست ایں جا

---

[1] در اصل یہ سلسلہ بہت دور پہنچتا ہے۔ رومیؔ فرماتے ہیں ؎

بہ زیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و ملائک شکار و یزداں گیر

زِ بیقراریٔ ما فارغست خاطرِ یار
دل نگر چہ خبر دارد از طپیدنِ موج
تا نمی گردد تب و تاب نفسہا برطرف
میدمد اجزائے ما چوں موجِ دریا ہر طرف

زندگی دراصل نام ہی اس جدو جہد، عمل اور حرکت مسلسل کا ہے۔ اقبالؔ نے بار بار جس طرح اس مسئلہ پر زور دیا ہے، وہ تشریح کا محتاج نہیں۔ بیدلؔ کے یہاں یہ رنگ دیکھئے:

زندگی محملِ کشِ وہم دو عالم آرزوست
می طپد در یک نفس صد کارواں از یک درا
باغِ جاں سختی ما سبزۂ جوہر دارد
بیستوں می شود آب از شررِ تیشۂ ما
جرأت پرواز برقِ خرمنِ آسودگیست
یکجہاں آشفتگی در بال و پر داریم ما

ارتقا کی یہ طلب اور فروغ کا یہ جذبہ کائنات میں ہر جگہ کارفرما ہے۔

ہر کفِ خاکے بجوشِ صد گداز آمادہ است
یک قلم اجزائے ایں میخانہ صہبا کردنیست

جب ہر کفِ خاک میں گداز ہونے کے لئے یہ جوش اور ولولہ موجود ہے تو ظاہر ہے انسان جو کائنات کا نقش حسین ہے، اس میں یہ جوش او ولولہ اسی نسبت سے قوی تر اور واضح تر ہونا چاہیئے۔ یہ جوش اور ولولہ، یہ آگے بڑھنے کی تمنا اس لئے ہے کہ انسان ابھی تکمیل کی منزل سے دور ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

بیدؔل اسی خیال کو بڑے شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

نیامدست شرابے بعرض شوخی رنگ
جہاں ہنوز سیہ مست سایۂ تاک است

جب محض سایۂ تاک کے اثر سے سیہ مستی کا یہ عالم ہے تو معلوم نہیں جب شراب اپنا رنگ نکھار کر پختہ آتش سیال بن کر رگ وپے میں سمائے گی تو میکشوں کا کیا عالم ہوگا۔

بہشت کے متعلق عام احساس یہ ہے کہ وہ ایسا عالم ہوگا، جہاں راحت ہی راحت اور سکون ہی سکون ہے۔ جہاں موسم کے سرد و گرم یا پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے جد و جہد سے نجات مل جائے گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہوں گی، ہیرے اور زمرد کے قصر ہوں گے۔ جنتیوں کی خدمت

کے لئے حوریں اور غلمان ہوں گے۔ کوئی خوف، کوئی کھٹکا نہ ہوگا۔ کوئی طلب، کوئی آرزو تشنۂ تکمیل نہ رہے گی۔ لیکن اس کی یکسانیت، اس جہان کی بے کیف یک رنگی۔ اس کا درد و سوز و سازِ آرزو سے محروم ہونا۔ یہ کون برداشت کرسکتا ہے؟ بیدؔل کہتے ہیں۔

گویند بہشت است ہمہ راحتِ جاوید
جائیکہ بداغت نہ طپد دل چہ مقام است

ایک خیال یہ ہے کہ دُنیا ایک امتحان یا آزمائش گاہ ہے۔ یہاں ذوق و شوق کی بھی آزمائش ہے اور تابِ نظر کی بھی، ہمت اور جرأت کی بھی۔ بیدؔل کا ایک شعر ہے:۔

کدام جلوہ کہ نگذشت ازیں سرائے غرور
تو ہم بتاز کہ میدانِ امتحاں خالیست

راہرو کا منزل تک جا پہنچنا ہی کامیابی اور کامرانی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو راہی سفر کو ہی اپنی منزل سمجھے، اس کے نزدیک منزل تک پہنچنا تھک کر بیٹھنا ہے۔

بوادئی کہ طلب نارسائے مقصد اوست
بہوش باش کہ منزل رسیدگاں لنگ اند

ایک اور شعر ہے :-

شمع تصویرم مپرس از دودِ داغِ حسرتم
اشک من عمریست تا گر دیدہ راہے میرود

تکمیل آرزو کے بعد زندگی کا سلسلہ صرف اسی طرح جاری رہ سکتا ہے کہ کوئی دوسری آرزو پیدا ہو جائے اور اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے۔ راہروِ شوق منزل قبول نہیں کرتا۔ اقبال نے سلطان ٹیپو کے پیغام میں لکھا ہے :-

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

بیدل کا یہ شعر دیکھیے :-

در عشق زپرواز ہوس آئینہ برگیر
ہر چند رہت قطع شود باز ز سر گیر

علاوہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس تگ و تازیں کمی نہیں آ سکتی :-

بے غبارے نیست ہر جا مشتِ خاکے دیدہ ام
شد یقیں کز بعد مردن ہم نمی میرد ہوس

جس ذرہ کے دل میں یہ جوش پرواز ہو وہ اپنی آزادی اور تسکینِ ذوقِ پرواز کے لئے خود صحرا پیدا کر لیتا ہے۔

عرصۂ آزادی از جوشِ غبارم تنگ بود

بر سرِ خود دامنے افشاندم و صحرا شدم

"اسرار" کے پیش لفظ میں اقبال نے پیر رومی کا ایک قطعہ نقل کیا ہے :-

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت

شیر خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

بیدل نے اسی خیال کو بڑی شاعرانہ نزاکت کے ساتھ یوں ادا کیا ہے :-

موج دریا درکنارم از تلاش و پو مپرس

آنچہ من گم کردہ ام نایافتن گم کردہ ام

مرزا بیدل کے کلام میں افسردگی اور فشاردگی جگہ جس ہمت، اولوالعزمی بلند فطرتی، حرکت اور عمل پیہم کا پیغام ملتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو ان کی افتادِ طبع ہے، کہ ہر جگہ بلندی کی طرف مائل ہے۔ ان کا تخیل نہ صرف بلند پرواز بلکہ کسی حد تک بیباک ہے۔ شیفتہ نے ایک جگہ ناسخ کے کلام کی

تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "طائر بلند پرواز خیالش جز بشاخ سدرہ آشیاں نسازد۔" ناسخ کے یہاں تو یہ بلند پروازی کچھ یوں ہی سی ہے - زیادہ سے زیادہ اسے خیالی بھول بھلیوں میں بھٹکنا سمجھ لیجئے۔ مغز اُن کے اشعار میں بہت کم ہے۔ اس لئے یہ فقرہ ناسخ سے کہیں زیادہ مرزا بیدل کے لئے موزوں ومناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تخیل کی بلند پروازی محض واہمہ نہیں ہے۔ اس میں مغز ہے، وزن اور وقار ہے، گرانمایگی ہے۔ حکمت اور فلسفہ کی گہرائی اور گیرائی ہے۔ وہ شاعر سے زیادہ حکیم ہیں۔ اسی لئے کبھی کبھی شاعرانہ زبان اور اسلوب بیان کا جامہ اُن کے خیالات پر تنگ ہوجاتا ہے۔ اور یہی حال اُن کے فرزند معنوی مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ہے۔

علامہ اقبال بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کے تخیل کی بلندی کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بڑی حد تک مرزا بیدل پر صادق آتا ہے۔ یہی رفعت پسندی بیدل کے اس رنگ طبیعت کی ذمہ دار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بیدل کی پیدائش ۱۰۵۴ھ میں ہوئی۔ یہ شاہجہان کا عہد تھا۔ جب سلطنت مغلیہ اپنے عروج اور شباب پر تھی۔ اس دور میں ہندی مسلمانوں کے تخیل کی رفعت پسندی تاج محل کے روپ میں معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ پھر بیدل نے اورنگ زیب کا عہد دیکھا جس نے

اپنی ساری عمر درویشی اور مجاہدہ میں گزاری۔ مرزا بیدل اورنگ زیب کے بڑے معتقد معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۰۹۷ھ میں جب اورنگ زیب نے بیجاپور اور دوسرے سال میں گولکنڈہ فتح کیا تو مرزا نے نواب شکر اللہ خاں کی معرفت ایک قطعہ تہنیت پیش کیا۔ لیکن اس کا مقصد کوئی صلہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ اپنی بے نیازی کا اظہار بڑی جرأت سے ان الفاظ میں کیا ہے:-

" للہ الحمد اندیشۂ دعاگو بہانہ جوئے تقریبے است کہ باآں وسیلہ تحفۂ فقرا پیش گذار دیا مصرعے درآنجناب معروض دارد وگرنہ چہ نواب وکدام منتطاب بلکہ چہ عالمگیر وکدام بدر منیر بطریق شوق بے پروا نگاشتنی دارد وآہنگ ساز بے نیازی سراز پردہ بر می آرد۔" [1]

غالباً مرزا بیدل کا یہ شعر اسی موقع پر ان کے حسب حال ہے:-

ساحل کہ اصل طینش از جوش تشنگی است
دریاست درکنار و لبش تر نمے شود

بیدل کے کلام کے بعض اور عناصر میں اقبال سے فکری ہم آہنگی ملتی ہے۔ مثلاً معرفتِ خودی۔ " بانگ درا " کا وہ بند پیش نظر رکھیے جو اس

---

[1] بیدل ص۱۵

مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

ع آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا

اور اس کے بعد بیدل کی یہ غزل پڑھیے :۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمتِ جست و جو
بخیال حلقۂ زلفِ او گرہے خورد و بہ ختن درآ
نفسے اگر نہ فسوں دہد بہ تعلق ہوسِ جسد
رہِ دامن تو ہمیکشد کہ دریں رباطِ کہن درآ

ایک رباعی میں فرماتے ہیں :۔

اشیا عرضِ خیالِ دیدن بودست | اسما ہمہ افسانہ شنیدن بودست
ایں جملہ ز خود بروں دویدن بودست | انساں گشتن بخود رسیدن بودست

یہ انداز معرفتِ نفس صوفیا کے اس مسلک سے مختلف ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ یہاں انسانیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ انسان خود بیں، خود نگر اور خود آگاہ ہو۔ اقبال نے ان چیزوں پر بار بار زور دیا ہے۔ بیدل لکھتے ہیں :۔

ز بیرِ عالمِ دل غافلیم ورنہ حباب
سرے اگر بگریباں فرو برد دریاست

اسے پڑھ کر ہمارا ذہن اقبال کے اس مصرعہ کی طرف منتقل ہوتا ہے :-

ع قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

اقبال کا ایک اور مشہور شعر ہے :-

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار   کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

یا ع وانمودن خویش را خوئے خودیست

بیدل کی یہ غزل اسی جوشِ نمود کی ترجمان ہے :-

ہر دل از نالہ بہارِ اثرے میخواہد   ریشہ پیرائی ہر تخم پرے میخواہد
ہر کجا نکہتِ گل پیرہن رنگ درید   نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے میخواہد
اضطرابِ پروبال آئینہ پرداز بست   یا ز گردیدنِ مژگاں اثرے میخواہد
قطرہ ہر گاہ کشد سر بہوائے نیساں   شوقِ جمعیتِ وضعِ گہرے میخواہد
ہر کجا چشم پر از مژدۂ دیدارے ہست   ہر کجا دل طپش آرد خبرے میخواہد
برق ہر جلوہ تقاضائی ناز دگرست   عرضِ خورشید غبارِ سحرے میخواہد

اور یہ اشعار بھی اسی جذبے کے ترجمان ہیں :-

چہ نقشہا کہ نشد جلوہ گر ز پردۂ شوق   چہ رنگہا کہ ندارد طلسمِ غنچۂ ذوق

ہمیں نفس کہ غبار تعلق دہی ست   ہزار پیچ و خم آوردہ شد بگردن طوق

عقل اور جنون کے تعلق کے بارے میں اقبال کی جو نظم اس بحث کے آغاز میں نقل ہوئی اُس میں بیدل کا یہ شعر نظم کی بنیاد ہے :-

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

بیدل کے یہاں اس خیال کی بار بار تکرار ملتی ہے -

دردسرِ جہانِ رنگ درخورِ دانش است وبس
نیست بکسبِ عافیت غیرِ جنوں مفید ما

اسی طرح فقر کی عظمت ، علم ظاہر اور علم باطن کی حقیقت ، طلب اور سوال کی مذمت ، خودداری ، آزادی ، استغنا وغیرہ کے بکثرت مضامین ہیں جو اقبال اور بیدل کے یہاں مشترک نظر آتے ہیں - بیدل نے زمان و مکان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے - لیکن اس بارے میں اقبال کے نظریات بیدل سے مختلف ہیں -

(ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی)

حصّۂ نظم

اِنتخاب

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن در آ

پئے نافہ ہائے رمیدہ بُو مپسند زحمتِ جستجو
بہ خیالِ حلقۂ زلفِ او گرہے خورد و بہ ختن در آ

غمِ انتظارِ تو بردہ ام برہِ خیالِ تو مردہ ام
قدمے بہ پرسشِ من کشا نفسے چو جاں بہ بدن در آ

ز سروشِ محفلِ کبریا ہمہ وقت می رسد ایں ندا
کہ بہ خلوتِ ادب و وفا ز درِ برہمن نہ شدن در آ

بہ خیالِ چشم کہ می زند قدح جنوں دلِ تنگِ ما
کہ ہزار میکدہ می دود بہ رکابِ گردشِ رنگِ ما

ز غبارِ بیدلِ ناتواں دلِ نازکت نشود گراں
کہ رود زیادِ تو نخود بہ خود چو نفس ز آئینہ زنگِ ما

شش جہت آئینہ دارِ شوخیٔ اظہارِ اوست
نیست جز مژگاں حجابے را کہ برداریم ما
تا نگاہے گل کند ذوقِ تماشا رفتہ است
چوں شرر سامانِ فرصت ایں قدر داریم ما

اثر گم کردہ آہنگم مپرس از عندلیبِ من
دریں گلشن نفس می سوزم از آتش نوائیہا

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نہ می رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما
چو غبارِ نالہ بہ نیستاں نزدیم گامے ز امتحاں
کہ ز خود گذشتنِ ما نہ شد بہ ہزار کوچہ دوچارِ ما

ہمہ را بہ عالمِ بے خودی قدحیست از مئے عافیت
سرو برگِ گردشِ ما بہ بیں چہ خطے کشد بہ حصارِ ما

صفِ رنگ لالہ بہم شکن مئے جوشِ گل بہ زمیں فگن
بہ بہار دامنِ ناز زن زحنائے دستِ نگارِ ما

نہ بدامنے زحیارسد نہ بہ دستگاہِ دعا رسد
چو رسد بہ نسبتِ پارسا کفِ دستِ آبلہ دارِ ما

دلِ ناتواں بہ کجا برد المِ تردد عاجزی
کہ چو سبحہ ہر قدم اوفتد بہ ہزار آبلہ کارِ ما

بہ نمودِ ہستئ بے اثر چہ نقاب شق کنم از حیا
تو مگر بہ من نظرے کنی کہ دلے عرق کنم از حیا

اگرم دہد خطِ امتحاں ہوسِ کتاب زند آسماں
مژہ برہم آرم ازیں و آں ہمہ یک ورق کنم از حیا

اگر بہ گلشن ز ناز گردد قدِ بلندِ تو جلوہ فرما
ز پیکرِ سرو موج خجلت شود نمایاں چو مئے ز مینا

ز چشمِ مستت اگر نیاید قبولِ کیفیتِ نگاہے
طپد ز مستی، برونِ آئینہ نقش جوہر چو موجِ صہبا

نخواند طفلِ جنوں مزاجم خطِ زلیست و بنائے ہستی
نقوم فلاطونِ ملکِ دانش اگر شناسیم از کفِ پا

بہ ہیچ صورت از دورِ گردوں نصیب ما نیست سربلندی
ز بعدِ مردن مگر نسیمے غبارِ ما را برد بہ بالا

نہ شامِ ما را سحر نویدی، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدی
چو حاصلِ ماست ناامیدی، غبارِ دنیا بہ فرقِ عقبیٰ

رمیدی از دیدہ بے تامل گذشتی آخر بہ صد تغافل
اگر نہ دیدی طپیدنِ دل شنیدنی داشت نالۂ ما

بہ ہر کجا ناز سر برآرد نیاز ہم پائے کم نہ دارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا

باولیں جلوہ ات ز دلہا ربیدہ صبر و گداخت طاقت
کجاست آئینہ تا نگیرد غبارِ حیرت دریں تماشا

بہ دورِ پیمانۂ نگاہت اگر زند لاف مے فروشی
نفس بہ رنگِ کمند پیچد ز موجِ مے در گلوئے مینا

شورِ جنوں در قفسِ ما ہمہ بیگانہ برآ
یک دو نفس نالہ شو از دلِ دیوانہ برآ

تاب و تبِ سبحہ بہل رشتۂ زنّار گسل
قطرۂ مے جوش زن بر خطِ پیمانہ برآ

اشک کشد تا کجا ساغرِ ناموسِ حیا
شیشہ بہ بازار شکن اندکے از خانہ برآ

نیست خراباتِ جنوں عرصۂ جولانِ فسوں
لغزشِ مستانہ خوش است آبلہ پیمانہ برآ

تا ز خودت نیست خبر در تہِ خاکست نظر
یک مژہ بر خویش کشا گنج ز ویرانہ برآ

ما و منِ عالمِ دوں جملہ فریب است و فسوں
رو بہ درِ خانہ زن از کلفتِ افسانہ برآ

در کہنہ تو آگاہی و غفلت ہمہ مغرور دریا ز میاں غافل و ساحل ز کرانہا
جز نالہ بہ بازار تو دیگر چہ فروشم اینست متاعِ جگر خستہ دکانہا

چو تخمِ اشک بہ کلفت سرشتہ اند مرا — بہ ناامیدی جاوید کشتہ اند مرا

طلسمِ حیرتیم یک نفس قرارے نیست — بہ آبِ آئینۂ دل سرشتہ اند مرا

فلک شکارِ کمندِ سست سرنگوئی من — نہ دانم از خمِ زلفِ کہ رشتہ اند مرا

نہ شد دریں درسگاہِ عبرت بہ فہمِ چندیں رسالہ پیدا

جنوں سوادے کہ کردم امشب ز سیرِ اوراق لالہ پیدا

اگر بہ صد رنگ پر فشانم ز دامِ جستن نہ می توانم

کہ گردِ پروازِ بے نشانم چو بالِ طاؤس ہالہ پیدا

قبولِ انعامِ بدمعاشاں بخود گوارا مگیر بیدل

کہ می شوند ایں گلو خراشاں چو استخواں از نوالہ پیدا

احتیاجِ خود شناسی جوہرِ آئینہ نیست

من اگر خود را نہ می دانم تو می دانی مرا

مقامِ وصل نایاب است و راہِ سعیٔ ناپیدا

چہ می کردیم یارب گر نہ بودے نارسیدن ہا

زنیرنگِ فسوں پردازیٔ الفت چہ می پرسی
تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدن ہا
دریں گلشن کہ رنگش ریختند از گفتگو بیدل
شنیدن ہاست دیدن ہا و دیدن ہا شنیدن ہا

از برگ ساز قافلہ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما

بر امیدِ وصل مشکل نیست قطعِ زندگی
شوقِ منزل می کند نزدیک راہِ دور را

بیدل از بال و پر بستہ نیاید پرواز
غنچہ تا وا نہ شود جلوہ نہ بخشد بو را

باکمالِ اتحاد از وصل مہجوریم ما
ہم چو ساغر مے بہ لب داریم و مخموریم ما
پرتوِ خورشید جز در خاک نتواں یافتن
یک زمین و آسماں از اصلِ خود دوریم ما
بحر در آغوش و موجِ ماست مجوے بر کنار
کارہا با عشق بے پرواست و معذوریم ما

علاجِ زخمِ دل از گریہ کے ممکن بود بیدل
بہ شبنم بخیہ نتواں کرد چاکِ دامنِ گل را

موجِ دریا را بہ ساحل ہم نشینی مشکل است
بیقراراں نذرِ منزل کردہ اند آرام را

زندگی محمل کشِ وہمِ دو عالم آرزوست
می تپد در یک نفس صد کارواں از یک درا

جرأتِ پرواز برقِ خرمنِ آسودگیست
یک جہاں آشفتگی در بال و پر داریم ما

بیدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد
نمی دانم کدامی بیوفا آئینہ چید اینجا

از ستمدیدگیٔ طالعِ من ہیچ مپرس
آنچہ پیشِ تو نگاہست خدنگ است اینجا

بیدل من و بیکاریٔ معشوق تراشی
جز شوقِ برہمن صنمے نیست در اینجا

ہستی بہ تپش رفت واثر نیست نفس را   فریاد کزیں قافلہ بردند جرس را
ہر دل نہ برد چاشنی از دردِ محبت   ایں آتشِ نیرنگ نہ سوزد ہمہ کس را

درہائے فردوس وا بود امروز   از بے دماغی گفتیم۔ فردا

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

یارہ در آغوش و نام او نمی دانم کہ چیست   سادگی ختم است چوں آئینہ بر نسیانِ ما

چہ وجود و چہ عدم بست و کشادِ مژہ است   چوں شرر ہر دو جہاں را بہ نگاہے دریاب

زہے چمن ساز صبح فطرت تبسمِ لعل مہر جویت
ز بوئے گل تا نوائے بلبل فدائے تمہیدِ گفتگویت

سحر نسیمے در آمد از در پیام گلزارِ وصل در بر
چو رنگ رفتم ز خویش دیگر چہ رنگ باشد نثار کویت

بہ جستجو ہر طرف فنا ہم ہماں جنوں دارد اضطرا ہم
بہ زیرپایت مگر بیا ہم دلے کہ گم کردہ ام بکویت

بہ عشق نازد دل ہوس ہم بہ بالد از شعلہ خار و خس ہم
رساست سررشتۂ نفس ہم بقدر افسونِ جستجویت

بایں ضعیفی کہ بار دارم شکستہ در طبع رنگ زردم
بہ گرد نقاش شوق گردم کہ می کشد عیر تم بسویت

اگر بہارم تو آبیاری وگر چراغم تو شعلہ کاری
زحیرتِ من خبر نداری بیارم آئینہ رو برویت

اے پرفشاں چوں بوئے گل نیرنگی از پیراہنت
عنقا شوم تا گردِ من یابد سراغِ دامنت

تجا بلہ ناز آشفتۂ رنگِ لباس آرائیت
بے پردگی دیوانۂ طرحِ نقاب افگندنت

ہر جا بروں جوشیدۂ خود را بہ خود پوشیدۂ
در نورِ شمعت مضمحل فانوسیٔ پیراہنت

ہر غبارے کہ دریں عرصۂ طوفاں برخاست ہمہ از شوخی و بیباکیٔ جولاں برخاست

گفتگو یکسر دلیلِ ہرزہ کاریہائے ماست تا جرس فریاد دارد کارواں آسودہ نیست

بہ غفلت آنچناں دوریم از دوست کہ تا اینجا رسد وصلش پیام است

شب کہ سودائے خیالِ یار در دل جوش داشت چشم وا کردن زمیں تا آسماں آغوش داشت

شش جہت کیفیتِ رنگِ تحیر بود فرش ہر طرف می رفتم از خود جلوہ بر دوش داشت

او خراماں بود اگر اشک از نظر می شد رواں او سخن میگفت اگر دل بر طپیدن گوش داشت

صحبتِ خود با خودش صد انجمن آہنگ داشت با وجودِ سازِ بے رنگی دو عالم رنگ داشت

بہر استقبال نازش ہر کہ گامے پیش رفت تا ابد می بایدش چوں بوئے گل از خویش رفت

ہوش اگر باشد کتابِ نغمہ ہا در کار نیست چشم وا کردن زمین و آسماں فہمیدن ست

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست؟ چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
دیر ازیں غصہ در آتش کہ چہ رنگست صنم کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

بیدل آں گوہر نایاب سراغ بہ محیطے ست کہ پر سیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش گل تواں گفت ولے چیدن نیست
عجز ادراک اگر فہمیدی معنی این ست کہ فہمیدن نیست
نسخہا در بغل و فہم محال جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

دیدہ اشک ہیکا رو دل ز داغ گلچین است
در بہار نومیدی رنگ عاشقاں این است

بہ محفلے کہ دل آئینہ رضا طلبی ست نفس درازیٔ فریاد پائے بے ادبی ست
خمارِ جامِ تسلی شکستن آساں نیست زنالہ تابہ خموشی ہزار تشنہ لبی ست

بیا کہ ہیچ بہارے بہ حسرتِ ما نیست شکستہ رنگیٔ اُمید بے تماشا نیست
توساز جلوہ کن و مدعائے دل دریاب زبانِ حیرتِ آئینہ بے تقاضا نیست

اگر ز وہم برآئی چہ موج کو گرداب ۔۔۔ جہاں بہ خویش فرو رفتہ است دریا نیست

بہر چہ میرسی از خود گذشتنی دارد ۔۔۔ بہوش باش کہ امروز رفت و فردا نیست

حساب بیکسیٔ ما کجا تواں دادن ۔۔۔ بقا کدام؟ چہ ہستی؟ فنا ہم از ما نیست

غریقِ بحر ز فکرِ حیات مستغنی ست ۔۔۔ رسیدہ ایم بجائے کہ بیدل آنجا نیست

باز سرگرمیٔ نظارہ بہ ساماں شدہ است ۔۔۔ شعلہ آتش دیدار گل افشاں شدہ است

صلح کل مذر حریفاں کہ دریں عشرت گاہ ۔۔۔ آتش و آب بہم دست و گریباں شدہ است

بیدل آں شعلہ کز و بزم چراغاں گرم ست ۔۔۔ یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تاباں شدہ است

ہر کفِ خاکے بہ جوشِ صد گداز آمادہ است ۔۔۔ یک قلم اجزائے ایں میخانہ صہبا کردنیست

نیامدست شرابے بہ عرضِ شوخیٔ رنگ ۔۔۔ جہاں ہنوز سیہ مست سایۂ تاک است

گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید

جائیکہ بہ داغت نہ طپد دل چہ مقام است

نیست در گلشنِ اسباب جہاں رنگِ ثبات — ہمہ از دیدۂ ما ہم چو نظر میگزرد
چوں نفس خانہ پرستیم نداریم آرام — عمر آسودگی ما بہ سفر میگزرد

برائے خاطرم غم آفریدند — طفیلِ چشمِ من نم آفریدند
جہاں تا ہم سر از فرمانِ تسلیم — کہ چوں ابرویم از خم آفریدند
اگر عالم برائے خویش پیداست — برائے من مرا ہم آفریدند

بختِ من زلفِ یار را ماند — وضعِ من روزگار را ماند
تا نظر باز کردہ ہیچ است — عمر برقِ شرار را ماند
مژہ واکردنی نمی آرد — ہمہ عالم غبار را ماند
محوِ یاریم و آرزو باقی ست — وصلِ ما انتظار را ماند

تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہِ کہ می خرامد؟
جگر بداغ کہ می نشیند نفس بہ آہِ کہ می خرامد؟
اگر نہ رنگ از گلِ تو دارد بہار موہوم ہستیِ ما
بہ پردۂ چاک ایں کتانہا فروغِ ماہ کہ می خرامد؟

غبار ہر ذرہ می فروشد بہ حیرتِ آئینہ طپیدن
رمِ غزالانِ این بیاباں پئے نگاہِ کہ می خرامد؟
ز رنگ گل تا بہار سنبل شکست دارد دماغ نازے
دریں گلستاں ندانم امروز کج کلاہِ کہ می خرامد؟
نگہ بہ ہر جا رود چو شبنم ز شرم می ماند آب گردد
اگر بداند کہ بے محابا بہ جلوہ گاہِ کہ می خرامد؟
مگر ز چشمش غلط نگاہے رسد بہ فریاد حالِ بیدل
وگرنہ آں برقِ بے نیازی پئے گیاہِ کہ می خرامد؟

چمن را جلوہ ات چوں بوئے گل بیتاب می سازد
خرامت شاخِ گل را موجۂ سیماب می سازد
غبار این بیاباں نغمہ شد از بسکہ مجنونم
بہ تارِ جادہ ہر نقشِ قدم مضراب می سازد

من آں غبارم کہ حکم نقشم بہ ہیچ عنوان در نگیرد
اگر سراپا سحر برآیم شکستِ رنگم اثر نگیرد

باین گرانی که دارد امروز رفت چندین خیال دوشم
چو گشتیم پائے رفتنی کو اگر محیطم بسر نگیرد

براه یاس سست سعی گامم که گر به لغزش رسد خرامم
کسے جز آغوش بے نشانم چو اشکم از خاک بر نگیرد

چو موج عمریست بے سروپا تلاش شوقم ادب تقاضا
چه ممکن است این که رشتهٔ ما چو عقده گیرد گهر نگیرد

خوشا غنا مشربے که طبعش بحکم اقبال بے نیازی
ز هرچه گیرد جزا نه خواهد ز هرچه گردد خبر نگیرد

همه راست ز انجمن آرزو که به کام دل ثمرے رسد
من و پرفشانئ حسرتے که ز نامه گل نسرے رسد

چه قدر زمنتِ قاصداں بگذاردم دلِ ناتواں
به برِ تو نامه بر خودم اگرم چو رنگ پرے رسد

به هزار کوچه دویده ام به تسلی نه رسیده ام
ز قد خمیده شنیده ام که چوں حلقه شد به درے رسد

ز کمالِ نظمِ جنوں اثر بگداخت بیدلِ بے خبر
چہ قیامتست بر آں ہنر کہ بہ ہم چو بے ہنرے رسد

فسردگیہائے سازِ امکاں ترانہ ام را عناں نہ گیرد
حدیث طوفاں نوائے عشقم خموشی از من زباں نہ گیرد

زخود بر آ تا رسد کمندے بکنگر قصرِ بے نیازی
بہ نبرد پا نہائے چمن دامن کسے رہ آسماں نہ گیرد

اگر بہ عزمِ کشادکاری ز گوشہ گیراں مباش غافل
کہ تیر پرواز را نہ شاید زمینکہ بال از کماں نگیرد

فتادۂ راز خاک بردار یا بہر نام استطاعت
کسے چہ گیرد ز سازِ قدرت کہ دستِ واماندگاں نگیرد

بہ کدام فرصت ازیں چمن ہوس از فضولی اثر کشد
شبِ خوں بہ عمرِ خضر زنم کہ نفس شرابِ سحر کشد

بہ طراز دامنِ ناز او چہ ز خاکساری ما رسد
نہ زد آں مژہ بہ بلندئ کہ ز گردِ سرمہ دعا رسد

نگاہ ما ز تماشائے غیر مستغنی ست
برون ز خویش چراغِ گہر نمی تابد

نہ رست تخمے دریں گلستاں کہ نو بہارے نہ کرد ساماں
ہوائے رنگِ گلت ز خاکم اگر برآرد چمن برآرد

نہ تنہا از قدح مستی و از گل رنگ می جوشد
نوائے محفلِ قدرت بہ صد آہنگ می جوشد

ہر دل از نالہ بہار اثرے می خواہد ریشہ پیرایۂ ہر تخم برے می خواہد
ہر کجا نکہتِ گل پیرہنِ رنگ درید نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے می خواہد
ہر کجا چشم پر از مژدۂ دیدارے ہست ہر کجا دل تپش آرد خبرے می خواہد

تو کار خویش کن اینجا توئی در من نمی گنجد
گریبان عالمے دارد که در دامن نمی گنجد

نه شد آنکه شعله وحشتے بدل فسرده فسوں کند
به زمیں طپم به فلک دوم چه جنوں کنم که جنوں کند

خورشید خرامید و فروغے به نظر ماند
دریا به کنار دگر افتاد و گہر ماند

بے پرده است و نیست عیاں راز من ہنوز
از خاک می دمد چو گلم پیرہن ہنوز
از بے نصیبئ من غفلت ہوا مپرس
در خوں طپید شوق و نگشتم چمن ہنوز
یک جلوه انتظار تو در خاطرم گذشت
آئینه می دمد ز سراپائے من ہنوز

بیار بادہ کہ در صیدگاہِ عالمِ ہوش — بہار می رسد از موجِ گل کمند بدوش

بذوقِ وصل جنوں در قفائے وحشتِ چمن — ہوا ز ابرِ بہاری کشودہ است آغوش

پئے صبوحیٔ شاغرکشانِ محفلِ شوق — نشاطِ جام بدست است و رنگ بادہ فروش

دوانده است بصد رنگ ریشۂ امواج — ز جوئبارِ رگِ گل بہار طوفاں جوش

ز گرم جوشیٔ رنگِ ہوائیاں گردید — کہ در گرفتہ در آفاق آتشِ خاموش

نوائے سلسلۂ شوق پردہ ہا دارد — چو عندلیب تو ہم بر جنوں زن و مخروش

وگر بسازِ جنوں ہوش بر نمی آید — نگاہِ آئینہ شو کسوتِ تحیر پوش

نسیمِ عشرتِ ایں فصل غنچہ در بغل است — نفس بہ موجِ ہوا محوِ ساز و بادہ نیوش

بقدرِ چشم کشودن طرب قدح پیماست — ز خوابِ گرمژہ واکردۂ بہ مستی کوش

بیا بہ سایۂ فرصت کہ می رسد بہ چمن — ہمائے رنگ ز برگِ گل آشیاں بردوش

نہ برگ دانم و نے رنگ ایں قدر دانم — کہ صف کشیدہ ہجومِ غبارِ رفتنِ ہوش

ز سازِ انجمن راز تا چہ می شنوند — کہ گل ز غنچہ سرِ انگشت خود کشیدہ بگوش

کدام رنگ و چہ گل جوشِ حیرتست اینجا — قبائے ناز دریدست خاکِ آئینہ پوش

حدیثِ پردۂ رنگ از کہ بایدم پرسید — زبانِ بوئے گل آواز می دہد کہ خموش

تو گر خود را نہ بینی نیست عالم غیر دیدارش
خودی آئینہ دارد کہ محرومی ست اظہارش

بہ حق تسلیم شو تا وارہی از این و آں بیدل
بہ دریا قطرہ چوں گم گشت، دریا داند و کارش

ز سیر گلزار چشم بستن کسے نہ شد محرم تسلی
کجاست آئینہ تا نمایم چہ ہیچ دارد بہار رنگش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

بہ شوخی بر نمی آید دماغ ناز یکتائی
من از حیرت فزودم صفر بر اعداد نیرنگش

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

متاعِ هستیٔ دارم مپرس از بود و نابودش
بصد آتش قیامت می کنی گر واکنی دودش

دنیا اگر دهند نه جنبم ز جائے خویش
من بسته ام حنائے قناعت به پائے خویش

چه نقشها که نه شد جلوه گر ز پردهٔ شوق
چه رنگها که ندارد طلسم غنچهٔ ذوق
همین نفس که غبار تعلق و همی ست
هزار پیچ و خم آورده شد بگردنِ طوق
سواد جوش تمنا چه آسمان چه زمین
نوائے زیر و بم آرزو چه تحت و چه فوق

تو کریم مطلق و من گدا چه کنی جز اینکه نه خوانیم
در دیگرے بنما که من به کجا روم چو برانیم
همه عمر هرزه دویده ام خجلم کنون که خمیده ام
من اگر به حلقه تنیده ام تو برونِ در بنشانیم

نمی دانم چہ نیرنگ است افسونِ محبت را
کہ خود را ہم تو می پندارم و با خود سخن دارم

روز وصلت باید از شرم آب گردیدن کہ ما
در فراقت زندگی کردیم و جانے داشتیم

مقیم و حلتم ہر چند در کثرت وطن دارم
بہ دریا ہمچو گوہر خلوتے در انجمن دارم

می گویم و حیرانم می پویم و گریانم حرفے کہ نمی فہمم راہیکہ نمی دانم

من آں شوقم کہ خود را در غبار خویش می جویم
رہے در جیب منزل کردہ ام ایجاد و می پویم

تا نظر بر چمن وضع جہاں وا کردیم ستمے بود کہ بر دیدۂ بینا کردیم
نہ چمن بوئے بقا داشت نہ گل رنگِ وفا غیرت آلودہ بہ ہر رنگ نظر ہا کردیم

آنچه بیداریٔ ما دام نظر می فهمید حیرتی بود که در خواب تماشا کردیم

تحیر مژدهٔ حسن بہارے داد کز شوقش
چو اشک از دیده تا دامانِ دل آئینه ها چیدم

ز درسِ دیدهٔ دل از منِ بیدل چه می پرسی
سراپا حیرتم حیرت نمی دانم چه فهمیدم

عرصهٔ آزادی از جوشِ غبارم تنگ بود بر سرِ خود دامنے افشاندم و صحرا شدم

موجِ دریا در کنارم از تگ و پویم مپرس
آنچه من گم کرده ام نایافتن گم کرده ام

در رہت نارفته از خود ہر طرف سر می زنم
ہمچو مژگاں بے خبر در آشیاں پر می زنم
چوں سحر خمیازهٔ آغوشِ فنا وا می کند
ما ز فرصت غافلاں ہم خوش که ساغر می زنم

چوں شرر روشن سواد فطرتیم اما چه سود
نقطهٔ تا گل کند آتش به دفتر می زنم

کشاد چشمے نه شد نصیبم به سیر نیرنگ ایں دبستاں
نگه به حیرت گداخت اما نه کرد روشن سواد مژگاں
خرد کمند ہوس شکارست ورنه در چشم شوق مجنوں
به جز غبار خیال لیلیٰ کجاست آہو دریں بیاباں
خیال آشفتگی تحمل اگر شود حرف یک تامل
دلِ غبارے به صد چمن گل نگاہِ موے به صد چراغاں
ہوائے لعلش کراست بیدل که با چنیں قرب ہمکناری
به بوسه گاہِ بیاضِ گردن ز دور لب می گزد گریباں

ز رہِ ہوس بتو کے رسم نفسے ز خود نه رسیده من
ہمه حیرتم به کجا روم به رہت سرے نه کشیده من
چو نگاه گرم به ہر طرف که گذشته محمل ناز تو
چو دل گداخته از پیت برکاب اشک دویده من

تو ز صد چمن طرب نمو من ز شبنمے نہ کہ آبرو
بہ بہار عالم رنگ و بو ہمہ جلوہ تو ہمہ دیدہ من

چیست انساں حرف و صوتِ فارغ از نطق و بیاں
جلوۂ نیرنگیٔ در پردۂ حیرت عیاں
یک نفس پرواز آہنگش ز ہستی تا عدم
یک قدم جولان عزمش بے نشاں تا با نشاں

زلافِ حمد و نعت اولیٰ ست برخاکِ ادب خفتن
سجودے می تواں بردن درودے می تواں گفتن

جمال تا نشود مائل نظارۂ خویش   ز آئینہ نتواں عرض ناز فہمیدن

زندگی در گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

طرۂ بہ ہوا فشاں چمنے بہ مشک تر آفریں
مژہ بہ آئینہ باز کن گل عالمے دگر آفریں

بہ کلامِ بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں

بے نشاں حسنے کہ درس جلوہ میخواند ز من
عالمے برہم زند نارنگ گرداند ز من

تا بہ جوش سرمہ از خاکستر من چوں سپند
خامشی را ہم حجبت نالہ میداند ز من

آبیار مزرعۂ خاموشیم اما چہ سود
شوق می کارد نفس تا نالہ رویاند ز من

بیدلم بیدل ز شرم سخت جانیہا مپرس
دور ازاں در خاک ہم آبست گریاند ز من

چنیں کشتۂ حیرت کیستم من کہ چوں آتش از سوختن زیستم من
نہ خاک آستانم نہ چرخ آشیانم پرے می فشانم کجا ئیستم من

بناز اے تخیل ببال اے توہم — کہ ہستی گماں دارم و نیستم من

مِن سنگ دل چہ اثر برم ز حضور ذکر دوام او
چو نگیں نہ شارکہ فرو برم بخود از خجالتِ نام او

بہ ہوا سرے نہ کشیدہ ام بہ نشیمنے نہ رسیدہ ام
ز پرِ شکستہ تنیدہ ام بہ خیال حلقۂ دام او

نہ دماغ دیدہ کشودنی نہ سرِ فسانہ شنیدنی
ہمہ را ربودہ غنودنی بکنار رحمت امام او

در طلسم عجز فرصت حال و استقبال کو — شش جہت یک گردش رنگست ماہ و سال کو

بیدلم بیدل مرا جز ہیچ بودن ساز کو — از عدم می جوشم انجامم چہ و آغاز کو
موقعے میخواہد اسبابِ غرور و عاجزی — در خیال آباد ہو ہو مے نیاز و ناز کو
قطرہ گرد انم طراوت از کجا ساماں کنم — در نگویم ذرہ ام چو ذرہ ام پرواز کو
در غبار سرمۂ انسان سازِ حیرتم — چوں نگاہم غیر خاموشی دگر آواز کو

عمر گذشت و می کشم آرزوئے لقائے تو
اے قدمِ تو بر سرم اے سرِ من بہ پائے تو

ہر چند دورم از چمن جلوہ گاہ او
میخانہ است شوق بیادِ نگاہِ او

کجائی اے جنوں ویرانہ ات کو خس و خاریم آتشخانہ ات کو

کہ کشیدہ دامن فطرتت کہ بہ سیر ما و من آمدی
تو بہار عالم دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی
سحرے حلیقۂ آگہی ستم است جیب جنوں درد
چہ ہوا بہ پردۂ آتشت کہ برون پیرہن آمدی
زعدم جدا نہ فتادۂ قدمے دگر نہ کشادۂ
مگر آنکہ پیش خیال خود بہ خیال آمدن آمدی
نہ سفر بہانہ طراز شد بہ قدم جنوں تگ و تاز شد
بہ خودت ہمیں مژہ باز شد کہ بہ غربت از وطن آمدی

نوبت به زمزمه چنگ زد نه نفس در دلِ تنگ زد
عدم آبگینه به سنگ زد که تو قابل سخن آمدی

ز مزاج سایهٔ و آفتاب اثر دوئی نه شرحه نهم
من اگر به جائے تو داشتم تو چسان بجائے من آمدی

به هوس چو بیدل بے خبر درِ اعتبار جہاں مزن
چه بلاست ذوق گهر شدن که چو موج خود شکن آمدی

بیدل اگر آگه شوی از درد محبت
یک زخم به صد صبح تبسم نه فروشی

بے خبر از خود مگذر جانب دل هم نظرے
اے چمنستانِ جمال آئینه دارد سحرے

نیست درین هفت چمن چوں قدرت اے غنچه دہن
گلبن نیرنگ گلے سرو قیامت ثمرے

حیرت قفسم کو اثر عجز و رسائی

مجبور ادب را چه وصال و چه جدائی

چو محو عشق شدی رہنما چه می جوئی | به بحر غوطه زدی ناخدا چه می جوئی
متاع خانهٔ آئینه حیرت ست اینجا | تو دیگر از دلِ بے مدعا چه می جوئی
به سینه تا نفسے ہست دل پریشان ست | رفوئے جیبِ سحر از ہوا چه می جوئی
چو شمع خاک شدم در سراغ خویش اما | کسے نه گفت که در زیر پا چه می جوئی
سراغِ قافلهٔ عمر سخت ناپیدا ست | ز رہگذار نفس نقشِ پا چه می جوئی

به ذوق دل نفسے طوفِ خویش کن بیدل

تو کعبه در بغلی جا به جا چه می جوئی

رباعیات

[illegible]

آنکس کہ منزہ است ز آب و گلِ ما　　بے او عدم است خلوت و محفلِ ما
نامش از پردہ بر زباں می آید　　واللہ کہ نیست جائے او جز دلِ ما

ای دین تو اصل و فرع ایمان و یقین ما
بے نور دلیل مغنی زرہ بین ما
ما را ز نمود انجم نقش را زنبیا
ایں نقش ساقط نگردد از گردن ما

اے غیب و شہادت تجھ سے پیدا
جو شے ہے عیاں ہے اُس سے پیدا
جو بات ادھر اُدھر سے پیدا
یہ شان ہے پیدا و نہاں بھی پیدا

اے دانہ ازیں مزرعۂ اندیشہ برآ	یعنی ز طلسم الفت ریشہ برآ
افسردگی لفظ بہ معنی مپسند	در شیشہ چو رنگ بادہ از شیشہ برآ

اے آئینۂ قدرت و ذات آپ کا
آں جوہر ایک صفات ایسا
در غیب احد است در شہادت احمد
ایں [illegible]

اے لاف کمالت بزبان عنقا
پرواز تعلّی سرپرد کا روان عنقا
بالیدن غوغای زدن پایہ پیکر و نفس
باید کہ ندارد آشیان عنقا

بیدل عبرت کمر کشودست اینجا | ماتم ز رخشک وتر کشودست اینجا
زاں پیش کہ کس نظر کشودست اینجا | چشم از مژہ موئے سر کشودست اینجا

بی دید ز وداع جامہ دوزان مرا
سیپارۂ پرسش کتاب سوزان مرا
بر روئے تو ہر نفس چو شمع رہ پارہ
می میرم و باز میفروزند مرا

اینش عوض خیال ویران بودست
اینہا ہمہ افسانۂ شیرین بودست
ایں جلوہ ز نور جلوہ دیرین بودست
انسان الگ نشین د دیدن بودست

آں را کہ بہ بیکسی نظر دوختن است　　　خبر یاس ز اسباب چہ اندوختن است
بے روئے تو ور چراغ کاشانۂ ما　　　افروختنی نیست ہمہ سوختن است

ہستی جز جان سخن و بیچون افزون نیست
از عالم الہام عشق جان بیرون نیست
ز خلق بیرون ز خلق بیرون غلطست
صحبت با اہل کی نیست با مردان نیست

این یار که بی تو بسر کنارش از رشک است
این بوسه خدا لیک آتشکاریش از رشک است
ای باغ تعین نام تو خسروان خبری
از بیک که مسند بهارش از رشک است

عارف که دماغ آگهی افسر اوست　　هستی و عدم سواد فرمانبر اوست
آن را که قضا منصب شاهی بخشید　　در هر کشور که رود بر کشور اوست

هر دین نمیرند و دیگر عیب است
شکفته الست که می بمه محبوب است
سه شب و سه بر سر هم
از نیکی دو شیکی آتش مطلوب است

تشخیص طلسم بی زبانی شیون است
از نکہ نہ بیانی نہ عیانی شیون است
تا معنی نیست بیان لال اثر با دارد
بی حرف و ندا شیون عین معانی شیون است

فریاد کہ آں طلسم نیرنگ شکست ساز طرب تحیر آہنگ شکست
فرصت چمنے در نظر آراستہ بود مژگاں بر ہم زدیم آں رنگ شکست

گر طبع نہ از ازل کرم می داشت
می دان چہ قضیہ کہ ستمگری کم داشت
از سجدہ ابلیس نمی شد ابا
گر شیطان صحیح جرم می داشت

زین پیش که ... درخاک ... بهشت نیز است
بینش همه ... سنجش کیفیت رنگ نیز است
زیب ... زینت معراج عافیت ممکن نیست
... [illegible] غبار آلجنیز است

بیدل شوقے بہ بیداد اوہام خوش است — عنقا بہ خیال دانہ و دام خوش است
تہمت کش ہستیم اما چہ علاج — عمریست عدم بدون این نام خوش است

از بس ... بر عرصه نمود می آید
از ... لبهای الفت ... می آید
... نبض ... تاب جهان ... پیدا است
... صدا ... ها ... می آید

بینش که خیال پیش بینی می بندد
احرام رقیب ما به آیین می بندد
بر این یقینی چو وهم [illegible] آگاهی
پیدایی نیست کلاه بر سر نقش می بندد

این فصل سر عقل نگون می خواهد   آیینهٔ هوش عرق خون می خواهد
پیداست ز گل کردن اسرار چمن   کاین محشر رنگ و بو جنون می خواهد

بر دل ز [illegible] دمید الفت و بینش
جمع خبر کلاه و فنون الهم دید پدید
از خوانان این دو [illegible] اسرار و [illegible]
وحشیه ما آیینه پیچ [illegible] و وحشت

بیدل بجگر مرہم ما می خواہند
صحرائی کمالت از ما می خواہند
اے بی‌ثبات محض ایں چہ ہستی نجید
سنہ ہمنہ ویران دوما می خواہند

دید صید من از یاس در نالہ کشود صیاد بہ نازِ جام لطفے پیمود
گرداند بگردِ سر و آزارم کرد بر دام ہماں حلقۂ دیگر افزود

اے سایۂ شخص یار بگر دیدہ چیست
دا عکس ز جلوہ دور بالید چیست
نقش از عدم وجود ما مستغنی ست
آئینہ الم شعاع تنبیہ چیست

وارث ہے یہی صورت دیدار کی اللہ ہو
اکسیر ہے انتشار ارادت دادوا کی اللہ ہو
ہے کس کو میسر وہ زبان ہزار جو فنا ہستی اپنی
ہر عید ہے مروسے اسعد چکی کی اللہ ہو

ہر زمزمہ پیام سازے دارد　　ہر گرد سراغ تگ و تازے دارد
عارف سبب گریہ چہ گوید با خلق　　دریا در طبع خود گدازے دارد

ہر صبح کو وہ بلبلے گلک یار سنتا
ہر دم ہے قانون جس نیت ساز سنتا
قوال گلک بربستہ اللہ ہو دفا مجہ سنتا
دنیا طلبان باز دوں اعجاز سنتا

امروز کہ وقت طوفان مقصود رسید
نظمم همه جا به جانب سبحه کشید
مارا که سراغ دعوی به دل نغمه ام
بی تکیه به اسناد نقش باید دید

سامان تو آں قدر مہیا گردد — گر قطره رسد به موج دریا گردد
از تخم نہال و از نہال آرد نخل — آں نخل به خود بالد و طوبیٰ گردد

هر جا که رهی تا دل مطرب بکشاید
در ساغر ما باده بپیما نماید
یارب به دعای سیلان یا دم جوید
دیوان غزل ها ز رو نقش افزاید

ساغر بخیر البیلے چشم فتاں تو بود
سرمۂ طرزِ نگاہ رشتۂ عنوانِ تو بود
دلدار در میکدہ تا کجا ہے جنبش
دیدہ حیرانِ سایۂ مژگانِ تو بود

دل محوِ جنابِ کبریا باید کرد   خوش باید بود عیش ہا باید کرد
بیدلؔ کارے دگر نہ آرد اینجا   جز آں کہ دعا ہائے شما باید کرد

مینہ و بادکار خانۂ سروں و فساد
نالاں کا گلۂ وائے زندگی رفتہ ہے یاد
فغاں کی کہ درین دکھڑے و دیکھ احباد
سنئے یہ بار وقت تسلیم برادرم داد

کاوش نفسی کہ طبع موزون دارد
صد غنچہ بہار از دل پر خون دارد
یک غنچہ بیان زاد سخن ز سامان نیست
آنجا کہ نفس سوختہ افسون دارد

عالم نہ بلندی و نہ پستی دارد
دل این ہمہ مخموری و مستی دارد
از دیر و حرم مقصد دل عشق خود است
این آئینہ سخت خود پرستی دارد

فرصت داری ز سرگری کار مبین
بر آئینہ الست شد مستی ز زنگار مبین
بر جبین خود شکن فشردہ وا کردن خم
یاد است ولی حضور زنہار مبین

جمعے بہ بینائے زلف و ہال جمع اند
جمعے بہ تماشائے خط و خال جمع اند
بے رنگ ہمہ را بہ حال جمع بینند
جمعیں کمال کسانیکہ بر کمال جمع اند

در کوئے دل آرام گذر باید کرد   فعل بد خویش را بدر باید کرد
آئینہ شوق با صفا باید داشت   در روئے رخ یار را نظر باید کرد

در نغمہ لب تنای سیر و دہ راز
کانسان کہ نوائے اوست مخرج پرواز
در زمینہ جادو ہیچ نہ الہی سست
در طبع نباتات بحر حیوان آواز

یاری به جز آه هم آغوشی نیست
در مقصد شعور جز خموشی نیست
در اندیشه آینه [illegible] نگاه [illegible] داران
از یاد الست اگر فراموشی نیست

---

۱۱۱ بیدل ز غم و نشاطِ دوراں بگذر — از بیش و کم مشکل و آساں بگذر
در گلشنِ دہر چوں نسیم دمِ صبح — آزادہ درآئی و دامن افشاں بگذر

در کارگه شوق دل جرأت کیش
در بند به تصویر جرس داشت به پیش
نقشی و بیرون ز نقوش راه نبود
می نالم و لیک بیکان در دل ریش

ای پیرهنت غربت و آتش و کفن
ای کرده سلسلت در میان سر یقین
بی منفعت اشتغال از برون دل از این نیست
بی بهره ز نیکی خانه و تابوت و سخن

بیدل تا سیر رنگ و بوها کردیم   صد عقده ز نیرنگ جهان وا کردیم
اما تو چه عالمی که حشر تصویر   در پردهٔ نقش تو تماشا کردیم

ای نسبت حضور جمعیت دستم
یاد است بیان بعد زبن سخن بفغانم
زنار وفا که دل به ابروان دارد
بیداد است پیچ و تاب تارم نفسم

از حیرانی اگر منفعل گردیدیم
وز نغمهٔ رنگی اظهار خجل پریدیم
صد [illegible] نامه [illegible]
بیدل [illegible] دیدیم

بیدل تا محو گلشنِ نیرنگیم
گاہے گل و گاہ غنچۂ دل تنگیم
گویند ز رنگہا برون باید بود
دشوار حقیقتے کہ ما ہم رنگیم

[illegible] حیرانی [illegible] زبانست
[illegible] داماں [illegible] ہست
[illegible] زبانِ [illegible] ہمہ ماست
[illegible] پیدا [illegible]

عمرے که شعور نظم ما هست پریشان
خیزے که با نقش نثر ما هست پریشان
دیباچه سرمه دو مختصر به پایان است
عاری مانده ز تحریر تو پیشان پریشان

دورم ز تو لیک بیگماں نزدیکم گر پیدایم و گر نہاں نزدیکم
نقش قدم خود نگر و یادم کن ہر جا باشم باین نشاں نزدیکم

از قد دوتا ندامت انگیخته ایم
در دامن نا امیدی آویخته ایم
بر طاق گذار خواه بر خاک افگن
اشکیم سر مژگان بهم ریخته ایم

رفتی و من از ضعف به منزل ماندم
چون نقش قدم به گرد محمل ماندم
خیزید [illegible] عمر [illegible] فرا [illegible] بود
هرچند دل با تو از رفیقان [illegible] ماندم

گر خاموشم به فکر فریاد توام | ور گویا سبحه خوانِ اوراد توام
هرچند در آتشم نشاندست فلک | شادم که چراغِ محفلِ یاد توام

هرچند نظر به صد چمن وا کردم
[illegible] با الم [illegible] به لاله سودا کردم
مضمون دگر [illegible] بخلوت [illegible]
یار [illegible] و من تماشا کردم

گر قابل کسب عملے می زادیم   در ورطۂ فکر خود نہ می افتادیم

دیدیم کہ دست ما بہ جایے نہ رسید   از سعیٔ جنوں داد گریباں دادیم

سالک که بهمه گوش شد شنیدن همه
بیننده که جمله چشم گشت دیدن همه
آنکه و جمع ما ذاتی دگر است
آنرا که بیابد یافت و دیدن همه

گر یافتی اسرار قدم بیش مجو　　ور فهمیدی ز لفظ معنیش مگو
تا طبع تو تهمت فضولی نکشد　　گلهاست درین بهار می بین و مبو

زین مرحله بایدت به تامل گذری
بر منظر قدم نمی‌تو از تک گذری
آن بحر به پیش پایاست یک قطره آب
چون آنکه بجد کن که بر آن پل گذری

یارب بسر ایں جاہ و حشمت باشی
در باغ جہاں بصد حشمت باشی
اے گلچیں باغ آرزوئے بیدل
[illegible] باشی بہار فراغت باشی

اے رہرو اگر ز خویش غافل باشی — سرگشتۂ تر از راہ بہ منزل باشی
چوں گوہر اگر بہ ضبط خود پردازی — در دریا ہم مقیم ساحل باشی

[illegible] مستی دیوانہ
[illegible] باشی آں [illegible] بیگانہ
[illegible] گوی صدساں
در [illegible] نیست [illegible] از خانہ

فردیات

به محفل شمع تاباں در گلستاں رنگ و بو باشی
الٰہی ہر کجا باشی بہار آبرو باشی

روز نشاط شب کرد آخر فراق یارم
خود را اگر نہ سوزم شمعے دگر نہ دارم

دیگر مپرسید از شوق دیدار
اندیشہ آبست از فرم اظہار

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بہ خود ساختہ ام، ساختہ ام

کارہا با غیرت عشق غیور افتادہ است
شش جہت دیدار و مارا از گریباں چارہ نیست

سیر ایں گلشن غنیمت داں کہ فرصت بیش نیست
در طلسم خندۂ گل بال و پر دارد بہار

شوق دیدارے کہ از دل بال حسرت می کشید
تا بہ مژگاں می رسد آغوش حیرت می کشد

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

من نہ می گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش

بہ ہر طرف گذری سیر نرگستاں کن
بہ قدر نقش قدم چشم دوستاں باز ست

کس نہ رفتہ بہ عدم ہستی اگر جامی داشت
خلقے از تنگیٔ ایں خانہ بہ صحرا زدہ است

کاش ہجراں داد من میداد گر وصلے نہ بود
شمع تصویرم کہ از من سوختن ہم ننگ داشت

نہ دام دانم نہ دانہ ایں قدر دانم
کہ دل بہ ہر چہ کشد التفات صیاد است

مردہ ہم فکر قیامت دارد
آرمیدن چہ قدر دشوار ست

کم ظرفیم از غفلتِ خویش ست وگرنہ
دریاست مئے ریختہ از جام حبابم

در وصل ز محرومی دیدار مپرسید
آئینہ ز فہمید کہ من باکہ دوچارم

طپیدم، نالہ کردم، آب گشتم، خاک گردیدم
تکلف بیش ازیں نتواں بہ عرضِ مدعا کردن

قطعات

چہ سازم ناتوانم ریخت رنگ سجدہ در کیشں
سر افتادہٗ دارم کہ پیشانی ست زانویش

بہار آلودۂ رنگ تمنا یست دلے دارم
کہ گر سیر گلے در خاطر افتد میکنم بویش

تا دو چار ناز کرد آں نرگس مستانہ ام
شوق جوشے زد کہ می پنداشتم میخانہ ام
یار شد بے پردہ دیگر تاب خودداری کراست
اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

کدام نقش کہ در کارگاہِ عالم نیست
چہ رنگ و بو کہ دریں مرغزار خرم نیست
جہاں طربکدہ ہا داشت ست لیک چہ سود
بہشت انجمن اتفاق آدم نیست

از کتابِ بیدلے یک نقطہ گر آید بدست
نسخہا آتش تواں زد تختہ ہا باید شکست
صد چمن باید بہ طوفانِ تغافل داد نت
تا بخونِ دل توانی اینقدر ہا رنگ بست

خودشناسی

احوالِ دیگراں زچہ بر خود فسردۂ
بیدل ز خود بگو کہ تو ہم کم نبودۂ

گر ریشۂ ز تخم تو آید بروئے کار
بند نقاب خرمنِ امکاں کشودۂ

برگ گلت ہزار چمن عرض رنگ و بوست
آئینہ از خودی و جہانے نمودۂ

مژگانِ تست بست و کشادِ طلسم دہر
اے چشم آگہی بچہ غفلت غنودہ

عالم تمام عرضِ پیامِ خودست و بس
اے شوقِ نالۂ کہ چہ از خود ستودۂ

یادِ یاراں

گو گذشتہ رفیقاں ز دل فراموشند
کدام نالہ کہ در پردہ اش نمی جوشند

چراغِ انجمن حیرت نظر بودند
کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموش اند

نہ رفتہ اند دریں بزم تا سخن باقیست
ز دیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوشند

شانِ فقر

اے بسا روشن دلے کز بے نیازیہائے شوق
چوں فروغِ مہر بر خاکِ سیاہ افتادہ است

اے بسا آئینۂ کز کسوتِ زنگاریش
یوسفستانے بخلوت گاہِ چاہ افتادہ است

معنئ اقبال نگر از غافلاں پوشیدہ اند
ورنہ در ہر خاک چندیں دستگاہ افتادہ است

ہر کجا گرد شکستے سرمہ آرایدبہ چشم
بے تامل نگذری آنجا کلاہ افتادہ است

ذرہ تا خورشید عرفاں جلوہ است اما چہ سود
دیدہ ہائے خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است

عالمے محمل بدوش وہم جولاں می کند
کیست تا فہمد کہ منزل ہم براہ افتادہ است

ماتمِ پدر

خورشید خرامید و فروغے بہ نظر ماند
دریا بکنار دگر افتاد و گہر ماند

آتشکدہ رفت و لرگرہ ریخت شرارے
دل آب شدہ قطرۂ خونے بہ جگر ماند

آں سایہ گذشت از اثر دست نوازش
ایں نقش قدم داغ شد و خاک بسر ماند

تہنیت ارسال گوڈری بہ شکر اللہ خاں

سزد کہ چشم ہوس از گل و سمن پوشیم
سرے کشیم دریں گوڈری چمن پوشیم

ہوس دمیکہ تمنائے ایں لباس کند
ہزار جاں بہم آریم تا بدن پوشیم

اگر باییں ہنرست آب و رنگ عریانی
چہ لازم ست کہ باعیب پیرہن پوشیم

ز آں بساط کہ وارستگی ست خلعتِ ناز
رقع سحر از بوئے یاسمن پوشیم

قماش مرحمت خالی اگر باییں رنگست
چو بوئے گل ہمہ نسریں و نسترن پوشیم

در صفتِ خرد

آدمی زادہ وارثِ خرد ست | بے خرد غیر نسلِ حیواں نیست
ہر کجا عقل کردہ است ظہور | مظہرش جز وجودِ انساں نیست
شاہدِ عقل چیست شرم و ادب | کہ ز ہر گاؤ خر نمایاں نیست
جزو لاینفکِ خرد شرم است | لیک ایں وصف در آسیمایاں نیست
کفر محل است بے حیائی و بس | ہر کرا شرم نیست ایماں نیست

محرومی

اے بسا علمے کہ از بے التفاتیہائے خلق
در مزاجِ معنی آگاہاں ہماں مستور ماند

بیدماغی ہائے مستاں چشمِ شوقے وا نہ کرد
موجِ مے در جامِ محو ریشۂ انگور ماند

زگلستاں مایہ حیرت خفتہ پیدائشی ست
عالمے افروخت شمع و ہم چناں بے نور بلند

چشم بندی چوں ہجوم لمعۂ دیدار نیست
باہمہ نزدیکی ایں برق از نظرہا دور ماند
گر کسے محرم نہ شد اندیشۂ غفلت کراست
حسن از بس بے نیازی داشت نامنظور ماند

تحیر زار

تا نفس برخود طپد در پے خودی غلطیدہ است
تا نگہ بر خویش جنبد حیرتے بالیدہ است
سِرّ ایں گلزار می خواہد گریباں چاک کن
صبح برخود داریٔ ما غافلاں خندیدہ است
پایہ از خود رفت تمہید دگر درکار نیست
ہر طرف مژگاں کشائی رنگ مینا چیدہ است

زبانِ بیدلے

اینچه تکلم می نگارد محض حرف و صوت نیست
هوش می باید که دریابد زبانِ بیدلے

گر همه جبریل باشد مرغ فهم آگاه نیست
تا چه پرواز است تو آشیانِ بیدلے

گوشِ دل در حیرتِ آئینه خوابیدن است
بے نفس دارد تکلم ترجمان بیدلے

هر که از خود شد تهی از هستی مطلق پر است
سجده می خواهد حضور آستان بیدلے

اعتبارات جهان از کاهشم افزوده است
صفر اعداد ظهورم از نشانِ بیدلے

چشم می باید گشودن سرمه گردن آگهیست
ناله کم دارد درائے کاروان بیدلے

از حبابِ من سراغ گوهر نایاب گیر
یک نفس چیده است بحر اینجا دکان بیدلے

حدیثِ خموشی

کدام قطرہ کہ صد رنگ در رکاب نہ دارد
کدام ذرہ کہ طوفانِ آفتاب نہ دارد

کدام غنچہ کہ جوشِ بہار نیست بہ جنبش
کدام نقطہ کہ جمعیت کتاب نہ دارد

بجائے خود ہمہ آئینہ حقیقتِ خویش اند
بہ موجِ غیر کسے نسبتِ حباب نہ دارد

چہ ممکن ست نگوید سراب با ہمہ خشکی
کہ پیشِ شوخئ موجم محیط آب نہ دارد

ولے تمیز بہ ہر جا کشودہ است نقابے
غبارِ دود نم ریزشِ سحاب نہ دارد

در آں مقام کہ موجِ گہر خرام فروشد
درنگ ہیچ کس اندیشہ شتاب نہ دارد

بہ عالمے کہ تواں جوہرِ نگاہ شمردن
بہ صفر دیدۂ اعمیٰ کسے حساب نہ دارد

سخن اگر ہمہ معنی ست نیست بے کم و بیشی
غبار نیست خموشی کہ انتخاب نہ دارد

حدیثِ جوہر آئینہ نیست غیر تحیر
سوال اگر ز خموشی بود جواب نہ دارد

کش مکش

بیدل از خجلت لوابانِ بساط جرأتم
با دو عالم ما و من پر می زنم در سرمہ زار

رشتۂ سازے بہ قانونِ تحیر بستہ ام
در خموشی ناگزیرم در فغاں بے اختیار

گر خمُشی گرم نفس برہم زند بنیاد ن
ور بہ حرف آیم دہد لبہائے خاموشم فشار

چوں قلم در وادیٔ عبرت رہے طے می کنم
سرنگونی بار گردن سجدہ پیشانی سوار

خامه را سعیٔ نگوں شرمندۂ تحریر کرد
سجده اینجا می کشد خطے .بپا لغزش آشکار

آسماں بالیدم و آفاق گل کردم به وہم
گاه توہم بود .جولانگاه شوخی گاه نار

عالمے گل کردم اما در نظرگاه یقیں
داغ موہومے تراشت از غیبت بے رنگ عار

گر علم گویم علم مستغنی است از ما و من
در زہستی دم زنم کو ساز د برگ اعتبار

ہیچ کس چوں من اسیر وہم ایں و آں مباد
تا نفس ہر می زند با خجلت افتاد ست کار

بے پر و بال چنوں پرواز عنقا ہمتے ست
اے کریم ایں ہیچ ہیچ را معذور دار

از ماست که بر ماست

ز چشم طالبان دانش آہنگ | مبادا محتجب اسرار نیرنگ
که در آفاق ہر جا کوہسار یست | غبار انگیزی ابر بہار یست
بہ ہر جا نقش ابرے با شکوہ است | ہمین تمثال شوخیہائے کوہ است
درین وحشت سر پژمردگی نیست | ہمہ آزادی است افسردگی نیست
زمین گیری کہ دارد سرگرانی | تلافی جوست از فیض روانی
اگر کوہ از فسردن شد زمین گیر | نہ شد نومید از امداد تقدیر
برنگے گرد باد و ماندگی صبر | کہ آخر ریخت رنگ وحشت ابر
فسردن زین صفت مطلق عنان شد | جنون گرد و باین صورت روان شد
بخارے کز دماغ شوق انگیخت | چو اشک اوّل بروئے خویشتن ریخت
معین شد بہ طبع معنی اندیش | کہ سیر خلق بیرون نیست از خویش

ہمین یک نامہ در کہسار پیدا است
کہ بر ما آنچہ می آید ہم از ماست

قدر و قیمتِ شکست

شنیدم کہ شیخ زماں بایزید
شبے داشت با عشق گفت و شنید

بہ بحرِ حضورِ حقائق شہود
خیالش نقابِ تمنا کشود

کہ یارب چہ آرم من بوالفضول
کہ یابد دریں بزم رنگِ قبول

ندا آمد از حضرتِ ذوالجلال
کہ فرش است اینجا دو عالم کمال

ز جنس عبادات علم و عمل
مبرّاست ایں کشورِ بے خلل

متاعے بہ جز نقص درکار نیست
کمالِ ترا کس خریدار نیست

ز جنسِ شکست آنچہ پیدا شود
بریں آستاں قیمتش وا شود

شکستِ تو اینجا درستی نماست
کہ بحر کرم سر بسر مومیاست

محیطیکہ رنگ گہر نقش بست
نہ خواہد ز امواج غیر از شکست

سلامت نمی زیبد از ساز موج
شکست است انجام و آغاز موج

بر آں گل کند گریہ ابر بہار
کہ رنگ شکستن نہ کرد اختیار

تامل و تفکر

خاک بودیم از بہار جلوۂ ساغر زدیم
دیگراں گلچیں شدند و ما چنیں بر سر زدیم
غافلاں از گفتگو رفتند تا موج و حباب
ما چو غواص از تامل بر سر گوہر زدیم
چوں سحر بر آسماں بردیم گرد خامشی
یک دو چیں از نالۂ داماں نفس برتر زدیم
ہم چو شمع آخر سراغ ما بہ بیرنگی رسید
ہم دریں محفل قدم بر عالم دیگر زدیم

مقام اولیا

از ید اللہ گر نشاں جوید کسے — جلوہ گاہش آستین اولیاست
آفتاب مطلعِ انوار ذات — روشن از ماہ جبین اولیاست

مزرعِ سرسبزیٔ کون و مکاں — تا قیامت خوشہ چینِ اولیاست
آنچہ می گویند از عرش برین — معنیٔ فرشِ زمینِ اولیاست
غیب در ہر جا شہادت می کند — وسعت آبادِ یقینِ اولیاست
گر بہ تفسیر کلام اللہ رسی — لفظ و معنی آفرینِ اولیاست
ہوش اگر بر اسمِ اعظم پے برد — یک قلم نقش نگینِ اولیاست

چہ می پرسی

حباب از بحرِ گوہر خیز نتواند نشاں دادن
سراغِ عالمِ دل از منِ بیدل چہ می پرسی ؟

رگِ ابر از فشارِ ریشۂ پژمردہ نکشاید
اثرہائے غنا از طینتِ سائل چہ می پرسی ؟

سپندم یک طپش عرضِ نوائے سوختن دارد
ز برقِ فرصتِ خود داغم از محفل چہ می پرسی !

خطِ وہم نفس نا خواندہ با معنی چہ پردازم
ہنوزم جادہ ناپیدا ست از منزل چہ می پرسی ؟

طرف محوست در تحقیق اسرار حق است غافل
بہ حق ہم گر خطابِ تست از باطل چہ می پرسی؟
نقاب و جلوہ ہر یک محو نیرنگ خود است اینجا
ز لیلیٰ پرس حالِ لیلیٰ از محمل چہ می پرسی؟

جذبۂ نمو

در قید جسم دل را نشو و نما محال ست
گنج [illegible] دانۂ ما از خاک اگر برآید
صد گل بہار دارد این غنچہ در شکستے
صبح ست زین گریبان یک چاک اگر برآید
پیچ و خم نفسہا دامِ رہ است بگسل
مے نشئہ است اما از تاک اگر برآید

مردانِ کامل

دلاوران کہ مہیائے سازِ جنگ خود اند
بہر نفس زدنے چون حباب سنگ خود اند

چوں صبح جوہر فتح از جبین شاں پیداست
زبسکہ آئینہ دار شکست رنگ خود اند

شکستہ اند طلسم غبارِ ہستیِ خویش
کلاہ فخر جہانند لیک ننگ خود اند

مدعائے نیرنگی

رنگہا آئینۂ تربیتِ بے رنگی ست
گر نظر محرمِ کیفیتِ اسباب شود

نہ ہمیں تاک دریں خمکدہ مستی دارد
ہر دلے را کہ گداز ند مئے ناب شود

سایہ را جبہ بشویند ز سر چشمۂ نور
تا ہماں پرتو خورشید جہاں تاب شود

ابر چشمے نہ فشارد ز غم دوریِ ہجر
خاک نم وزدد و عرض گل سیراب شود

بحر جوشے زند و موج بہ طوفاں آید
موج پیچید بہ خود و مایۂ گرداب شود

انتظارِ ہوس گل کند از پردۂ شوق
نا امید آئینۂ دیدۂ بے خواب شود

مدعا زیں ہمہ نیرنگ جز ایں نتواں یافت
کو دلے خوں بہ چکد تا بہ جگر آب شود

حیرت و بے خودی

دلدار رفت و بے خودیم در کنار ماند
تمثال جست و آئینۂ حیرت شکار ماند

زاں دامنے کہ بر من بے دست و پا فشاند
در عرصۂ خیال رمے از غبار ماند

مژگاں نبرد صرفۂ آغوشی از وصال
آخر نصیب دیدہ ہماں انتظار ماند

چوں صبح تا نفس زده ام سینه می درم
فرصت چه جام داشت کز و ایں خمار ماند

اکنوں سراغ جلوهٔ او حیرتِ من است
زاں شعلهٔ رمیده همیں داغدار ماند

دیارِ متھرا

در زمینے که محبت اثرے کاشته است
گرد او خرمن چندیں طپش انباشته است

بر بهارے که ازیں کوچه وزیده است نسیم
جگر چاک ز صبحش علم افراشته است

همه تن شوق شود وادیٔ مجنوں دریاب
مشهد سوختگاں بوئے دلے داشته است

انجام کار

چشم بر وضع جہاں وا کردہ ہشیار باش
کایں ہمہ ہنگامۂ عشرت بہ غم خواہد کشید

حسن رنگیں خواہد افگندن ز بیرنگی نقاب
قامتِ رعنا بہ پستی ہا علم خواہد کشید

می رسد آخر صفِ برگشتۂ مژگاں بہ خاک
واں درازیہائے گیسو تا قدم خواہد کشید

ابروئے پرخم کہ ناخن بر جگرہا می زند
عاقبت ہا ناخنِ پا سر بہم خواہد کشید

بر نقوشِ اعتبارات کہ دارد ما و من
ہر رگ از یک جنبشِ مژگاں قلم خواہد کشید

چشم وا کردی زمانے گوش می باید شدن
شوخیٔ ایں جلوہ تا افسانہ ہم خواہد کشید

حیرتِ شبنم دریں گلزار دارد چشمکے
کایں ہمہ الفت نگاہی ہم برم خواہد کشید

عبرت آبادست این جا عاقبت وارستگی ست
هر که دل بر این و آں بندد الم خواهد کشید

سبک روحی

بیک دو روزه سر و برگ زندگی مپسند
که بهر خلق پئے سودِ خود زیاں باشی

اگر غبار شوی محوِ دامنِ خود باش
چناں مباش که تشویش دیگراں باشی

نفس بدوز و سبکروح زندگانی کن
مباد بر دلِ آئینۂ گراں باشی

سراب نظر

همه غیب است شهود اینجا نیست
جمله اخفاست نمود اینجا نیست

اصل هر سوسن و گل نیرنگیست
جز همیں سرخ و کبود اینجا نیست

شعلہ خاکستر محض ست آخر
جز دمے گرمی و دود اینجا نیست

نتواں جلوۂ مطلق دیدن
آنکہ ایں پردہ کشود اینجا نیست

اعتبارات ہمہ اوہام اند
تو عدم باش وجود اینجا نیست

بے بصری

افسوس کہ ما دامنِ پندار گرفتیم — خورشید عیاں بود شبِ تار گرفتیم

از غفلتِ دل معنیِ بے پردہ نہاں ماند — صد جلوہ در آئینۂ زنگار گرفتیم

در گلشنِ تقلید نشستیم بہ تقلید — اینہا ہمہ رنگست کہ دیوار گرفتیم

جاں بود کہ ما جسم نمودیم تصور — گل بود کہ ما کج نظراں خار گرفتیم

عالم ہمہ یک نسخۂ آثارِ شہود ست — غفلت چہ فسوں خواند کہ اسرار گرفتیم

آوارۂ اوہام نمودیم یقیں را — یعنی ز تامل رہِ گفتار گرفتیم

سودائیِ وہم ست تخیل چہ تواں کرد
از تنگیِ دل خانہ بہ بازار گرفتیم

خودناشناسی

چرا اے دل بہ داغ بے تمیزی آشنا گشتی
کدامی پردہ چشمت بست کز تحقیق وا گشتی

نگہ گردید آغوشِ وداعِ حق شناسیہا
سراپا وصل بودی چشم وا کردی جدا گشتی

کدامی غول در صحرائے گمراہی دلیلت شد
کز انسانی گذشتی طالب مردم گیا گشتی

سرت از تاج "کرمنا" گرانی داشت اے غافل
کہ فرشِ انتظارِ سایۂ بالِ ہما گشتی

عنانے مطلق را داغ صد حرص و حسد کردی
بخود خندہ تامل کن چہ بودی و چہا گشتی

حباب پوچ مغزے نقش ہستی آخر اے گوہر
دلے در جیب تمکیں داشتی بیدل چرا گشتی

بہ فہم نیستی آئینۂ اسرار ہستی شو
چہ قدر ذرہ دانستی بخورشید آشنا گشتی

خواب و بیداری

چیست بیداری ز باغِ وہم وظن گل چیدنی
خواب، یعنی از غبارِ خود نگہ دزدیدنی

کبر و ناز آئینۂ نقشے کہ نتواں بست ہیچ
ما و من تعبیرِ خواب دیدن و نادیدنی

صد رہ از کم وسعتیہائے ظہور افگندہ ایم
بر رخِ عالم نقاب از یک مژہ پوشیدنی

ساز ہستی و عدم بست و کشادِ چشم ماست
خواب و بیداری نہ دارد بیش ازیں فہمیدنی

فہمِ راز

بہ فہمِ راز گوشِ ہوش می باید نہ گوشِ خس
کہ ایں حرفِ نگو بارِ شنیدن بر نمی دارد

بہ گلزارِ خیالم جلوہ ہا آمادنِ اسپ است اما
گل آنجا رنگ و صبح آنجا دمیدن بر نمی دارد

بروئے ہر دو عالم بستہ مژگاں و معذورم
بہارے در نظر دارم کہ دیدن برنمی دارد

جوہر ذاتی

ہمچو شبنم از تامل دیدۂ گر وا کنی
برگ برگِ ایں چمن جز لوح استعداد نیست

جوہر ذاتیست موزونی نہ کسب عارضی
گل بہ سعیٔ پرفشانیہا چو سرو آزاد نیست

باغباں گر خوں خورد ابر آبرو بر خاک ریز
نیست گل غیر از گل و شمشاد جز شمشاد نیست

ہم بہ قدر صافی است آئینہ تمثال آشنا
فہم ذاتی گر نہ باشد ہیچکس استاد نیست

موجہا یکسر بہ تیغ شوخیٔ خود بسمل اند
دل تپش فرماست اینجا حاجت ارشاد نیست

طالبِ صلہ

اے بسا معنئ روشن کہ ز حرصِ شعرا
خاک جولانگہِ اسپ و خرِ اہلِ جاہ است

وے بسا نسخہ کہ در مکتبِ تشویشِ طبع
روسیاہ ابد از مدحِ وزیر و شاہ است

صلہ مشتاق گدا طبع ز مضمونِ بلند
گر ہمہ پاے بہ افلاک نہد در چاہ است

مرجعِ معنئ ایں شستِ خیالاں دریاب
تا بدانی چہ قدر فطرتِ شاں کوتاہ است

مادحِ اہلِ صفا باش کہ در علمِ یقیں
وصفِ ایں طائفہ تفسیرِ کلام اللہ است

بہ قصیدہ گویانِ سلاطین

اے کہ تعریف سلاطیں کردۂ / مشق تعلیم شیاطیں کردۂ

چیست تعلیم شیاطیں؟ حُبِّ جاہ / اے شیاطیں مرشدت رویت سیاہ

فخر طبعت مدح شاہے بیش نیست / کاں ہمہ تخت کلاہے بیش نیست

امتیازے تا بدانی شاہ کیست / ایں قفس پروردہ وہم جاہ کیست

بر سرش افتادہ آں زریں رخام / آمدہ پایش بہ سنگے تخت نام

تخت سیم و افسر زریں دو سنگ / او چو آتش درمیانِ ایں دو سنگ

فی الحقیقت آتش است آں شاہ نیست / لیک ہر آتش پرست آگاہ نیست

قربِ ایں آتش بلائے جان تست / برق دین و خرمنِ ایمانِ تست

گر بہ بزم شاہ قرب اندیشۂ / بیگماں زردشت کافر پیشۂ

رفتہ گیر آئینۂ دینت ز دست / نیست ہرگز حق پرست آتش پرست

ذوق و شوق

یاد ایامے کہ جاں مشتاق و دل مدہوش بود
ہر مژہ واکردنی تمہید صد آغوش بود
تا چہ پردازد تغافل مو بمویم داشت چشم
تا چہ فرماید تبسم عضو عضوم گوش بود

اثرِ صحبت

ریشہ با آب چو سازد گلِ احمر گردد
خاک چوں طالب خورشید شود زر گردد
صحبتِ صاف دلاں جوہر اکسیر غنا ست
بے صدف قطرہ محال است کہ گوہر گردد

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

الٰہی تہمت آباد ظہوریم
ز ہستی تا عدم یکدسبت دوریم

کمند نارسائی صید آہیم
چراغ خامشی برق نگاہیم

سراپا اشک بیتابی عنانیم
قدم پیدا نے واز خود روانیم

عنانِ ما کہ دارد جز چکیدن
دلیل ما کہ غیر از نارسیدن

دریں دریا شکستن میرود بیش
چہ خواہد موج از بیتابی خویش

طلب سرمایۂ شوقیم، ہا کو
اقامت آرزو داریم، جا کو

نہ پائے رفتن و نے جائے ماندن
دریں رہ حیف رفتن، وائے ماندن

عرفان خویش

اے کہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش
عمرہا باید کہ دریابی زبانِ خویش را!

روزگارے در قفائے وہم باید تاختن
تا دریں صحرا بدست آری عنانِ خویش را

در ہوائے بے نشانی تا نہ گردی بے نشاں
سخت دشوار است پے بردن نشانِ خویش را

مدتے برہم زدن دارد قماشِ خوب و زشت
تا شناسی جنسِ موہوم دکانِ خویش را

مذمتِ نفاق

دلِ نفاق پرست آفتِ بنائے وفاست
حذر کنید ازیں پنبۂ شرر آلود

اگر نگاہ تنزہ سراغِ جلوہ اوست
نمی تواں بہ تماشائے نو بہار آلود

چہ جائے غیر، نفس ہم ز دل بروں آرند
خیالِ دوست مبادا شود غبار آلود

حیرتِ نظارہ

اے خوش آں حال کہ چوں برتو نظر بکشایم
ہر نفس چوں نفس از خود روم و باز آیم

جلوہ ات ہر قدرم ساغر نیرنگ دہد
از تحیر چہ شناسم کہ چہ مے پیمایم

شوق ہرچند دو عالم کند از من لبریز
جز در آغوش تو خالی نہ نماید جایم

بہ خیال تو چناں گم شوم از ہستیٔ خویش
کہ عدم ہم نتواند کہ کند پیدایم

کرشمۂ نگاہِ ناز

تا دو چار ناز کرد آں نرگس مستانہ ام
شوق جوشے زد کہ می پنداشتم میخانہ ام

یار شد بے پردہ دیگر تاب خودداری کراست؟
اے رفیقاں نو بہار آمد کنوں دیوانہ ام

مثنوی

طوفانِ بہار

تعالی اللہ چہ طوفانِ بہار ست — کہ چوں گل شش جہت گل در کنار ست

اگر خاکست جولانگاہِ سوداست — وگر آبست موّاجِ طپشہاست

ز رنگ و بو جنونے خفتہ یکبار — بشورِ خندۂ گل گشتہ بیدار

گریباں چاکیٔ آئینۂ خاک — سحر جوشاندہ از تمثالِ افلاک

بہ ہر سو حیرتے واکردہ آغوش — جہاں در جیب و مجنوں می زند جوش

در و دشت از ہجومِ رنگ باغیست — چو گل یکسر جنونِ تر دماغیست

طراوت بسکہ شوخی کرد بنیاد — فلک کشتی بہ طوفانِ ہوا داد

ز گل جا بر چمن شد ایں قدر تنگ — کہ چوں بو بر ہوا بست آشیاں رنگ

بہ خود پیچیدنی دارد مشوش — نگہ از رنگِ گل چوں موجِ آتش

خروشے کز دلِ بیروں شتابد — ز گردِ رنگ و بو در سرمہ خوابد

جنونِ بیدلی بر خویش بالید — سویدا دستگاہِ ابر گردید

نمی از دامنِ مجنوں فشردند — شفقہا شعلہ بر افلاک بردند

کجائی اے ز ساز رنگ غافل — زچشم بستہ منشیں دست بر دل

دو عالم نیست غیر از یک جنوں خند — شگفتنہاست مژگاں بستنت چند

تبسم بسکہ می بارد بہ افلاک — سحر گردیدہ چینِ دامنِ خاک

ز عطرست آں ہمہ سرمایۂ گل — کہ بوئے مشک دارد سایۂ گل

بہ وصفِ ایں بہارِ رنگ و بو خیز — نفس چوں رشتۂ شمع ست گلریز

قلم تا حرف رنگیں می نگارد — رقم جوشِ پر طاؤس دارد

بہار اینجا نشد آئینہ پرداز — مگر در کسوتِ کیفیتِ ناز

تراشیدہ است حسنِ گلعذارے — ز ہر کیفیتے آئینہ دارے

ہمہ حسن است از حیرت خبر گیر — نگہ مجنوں کن و لیلیٰ بہ بر گیر

بہ ہر جا شبنمے وا کردہ مژگاں — بایں رنگست حیرانی پر افشاں

کہ مارا نیست جز شوقی فزودن — مگر آئینہ از زنگے زدودن

دریں حیرت سرا دارد مہیا — نگہ از جلوہ سامانِ تماشا

متاعِ حسن یکسر بابِ عشق ست — ہماں آئینۂ اسبابِ عشق ست

اگر طوقے ز قمری سر بر آرد — ز شمع سرو دودِ حلقہ دارد

دگر پروانہ داغِ چیدہ باشد — چراغش پرتوِ بخشیدہ باشد

نواہائے پئے منقارِ بلبل — صدائے چیدہ از تارِ رگِ گل

نفس در دیدہ دارد شوخیٔ رم　　ز بوئے گل نگہ در چشم شبنم
سحر را از ہجومِ شوق بیتاب　　نفس در رنگ شبنم میشود آب
ہوا ہم تا بہ گلشن راہ دارد　　شفق در آستینِ آہ دارد
زبس شوق ست اینجا عیش تمہید　　چو شمع از خارہا گل می تواں چید
ز ساماں ، جوشیٔ عیش مرتب　　چو گل خمیازہ دارد جام برلب
دریں گلشن بہ ہرجا آرزوئیست　　اسیرِ الفت ایں رنگ و بوئیست
ہمہ گرد وحشت اینجا سر برآرد　　ز الفت رشتۂ شیرازہ دارد
پرافشانست شوخی رنگ و بو نیست　　تمنا جز حصولِ آرزو نیست
نگہ از خود تماشا آفرین است　　مژہ باید کشودن جلوہ اینست
چمن زاداں ہمہ حیرانِ خویش اند　　حبابِ جلوۂ طوفانِ خویش اند
بہ عشقِ قامتِ خود سرو آزاد　　ندارد از بہار رنگ و بو یاد
زبس رعنائیٔ خود کردہ مستش　　ز خود در گردنِ یار ست دستش
نشاید از خیالِ خود بروں جست　　ہجومِ حیرت است آئینہ در دست
تامل کن اگر فہمیدنے ہست　　کہ با ہر برگ دست و دامنے ہست
ز جیبِ غنچہ بوئے دارد آواز　　کہ اے غفلت نوایانِ جنوں ساز
بہ فکرِ غیر کے آہنگ داریم　　بہ صد آغوش خود را تنگ داریم

به عرضِ راز تا سوسن زند جوش ـ زباں در سرمه می غلطد که خاموش

جہاں گوشِ سخن فہمے نه دارد ـ مبادا گفتگو دردِ سر آرد

به خود پر می زند نکہت که بس کن ـ خرد دیوانه شد ضبطِ نفس کن

به ضبطِ خود سحر واکرده آغوش ـ ہوا ہم در پئے خود رفته از ہوش

دریں فصلِ نشاطِ مستی آہنگ ـ که می جوشد جنوں در کسوتِ رنگ

دلے داری تو ہم یک غنچه خوں کن ـ به جیبِ خویشتن طوفانِ جنوں کن

برنگِ گل ز عریانی قبا گیر ـ ز جیبِ پارهٔ داماں ہوا گیر

چه لازم با خرد ہم خانه بودن ـ دو روزے می تواں دیوانه بودن

چو گل باید شد از جامِ ہوا مست ـ ولے چوں غنچه باید دادن از دست

به فکرِ خانماں پرداختن چند ـ متاعِ وہم و ظن تا باختن چند

چو بوئے گل به پروازِ جنوں آے ـ بجو تا وارسی از خود بروں آے

نشاطِ امروز در رہنِ جنوں ست ـ خرد از جرگهٔ عشرت بروں ست

به پرہیز از کشاکش ہائے تدبیر ـ مبادا بگسلانی ربطِ زنجیر

به فرقِ ابر چتر از دودِ سودا ست ـ ہوا از بوئے گل زنجیر در پا ست

کنوں اندیشهٔ فرزانگی چیست ـ گلے رنگیں تر از دیوانگی چیست

به ہر رنگے از بہارِ زندگانی ـ جنونِ دسته کن گر می توانی

بنے برسازِ بے آہنگ مشتاب　　نوائے بلبل زنجیر دریاب

نہ از نالۂ زنجیر آگاہ　　کہ بر آہنگِ سازِ خودکشی آہ

کجا آہنگ کو سازے جنوں ساز　　بہ زنجیر پر افشا نیست آواز

نہ زنجیریست اینجا نے جنونے　　خیال از وہم می خواند فسونے

نفس زنجیر و ما آواز زنجیر　　تحیر نغمہ ایم از سازِ زنجیر

رم زنجیر ما از نالہ پیش است　　سپند از شعلۂ آواز پیش است

تو خواہے زندگی خواہے فنا گیر　　صدائے موج زنجیر ہوا گیر

ز زنجیرے صدائے وام کردند　　خیالے را تعلق نام کردند

تعلق جز فسونِ وہم و ظن نیست　　جنونِ فرصت است این ما و من نیست

چہ فرصت فکر اوہام تعلق　　چہ ما و من ہمیں دام تعلق

تعلق حشرِ طوفان خروشیست　　بہ زنجیر این قدر نغمہ فروشیست

جہاں زیں ساز دارد مایۂ شور

الٰہی خانۂ زنجیر معمور

تمت